اندھی لکیریں

مصنف:

مقبول الٰہی نئی پود کے افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ ابھی تک اس نے بہت تھوڑے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن جتنے بھی لکھے ہیں۔ ان کے مطالعے سے پڑھنے والے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کا آرٹ جاندار ہے، اس کے کردار جیتے جاگتے ہیں اور اس میں مشاہدے کی بے پناہ قوت موجود ہے۔

مقبول اپنے افسانے کے موضوعات روز مرہ زندگی میں ڈھونڈتا ہے۔ اور ان کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ترقی پسند ہے۔ لیکن وہ ان روایات سے دامن بچا لیتا ہے جو صحیح یا غلط طور پر ترقی پسند ادب سے وابستہ سمجھی جاتی ہیں۔ اور جنہیں سنجیدہ طبقہ پسند نہیں کرتا۔

—عبدالسلام خورشید

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

اندھی لکیریں

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

مقبول الٰہی ملک

اندھی لکیریں

مکتبۂ اردو

Taj Tahir Foundation

[illegible]

[illegible]

[illegible]

Taj Tahir Foundation

پرویز کے نام! ——————

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

بار اوّل

قیمت :- ۲—۸—۰

پبلشر :- چودھری افتخار علی

پرنٹر :- اُردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور

Taj Tahir Foundation

افسانے

تعارف ، ۹
شکست ، ۱۷
تلافی ، ۴۱
تیاگ ، ۵۷
اندھی لکیریں ، ۷۳
سراب ، ۹۱
بھینٹ ، ۱۰۱

شادیانے ، ۱۰۷

رس کے دھالیے ، ۱۲۱

جھوٹی ماں ، ۱۳۵

بجھے دیپ ، ۱۵۷

Taj Tahir Foundation

تعارف

ادب کی دو ہی قدریں مستقل اور دائمی ہیں۔ افادی اور جمالیاتی ۔ ہر ادب کو پرکھنے کے یہی دو بڑے بڑے معیار ہیں ۔ کہ ادیب کیا کہنا چاہتا ہے ۔ اور کس انداز سے کہہ رہا ہے ۔ اگر کوئی ادب حسین ہے اور مفید ہے تو صحیح الخیال نقاد اسی پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دے گا۔ اب یہ امر عالمگیر طور پر مسلم قرار پا چکا ہے۔

Taj Tahir Foundation

کہ ادب کی مختلف اصناف میں افسانہ ان دونوں
بنیادی قدروں کی حفاظت بہترین طریق سے کر
سکتا ہے۔ چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں
میں زیادہ تر انہی لوگوں کی عظمت مسلم اور پائدار
ہے جو افسانہ نگار تھے۔ یہاں تک کہ ادب
کا نوبل پرائز حاصل کرنے والوں میں بھی غالباً
نوّے فیصدی سے زیادہ افسانہ نگار ہیں۔ اس
کی وجہ بھی یہی ہے کہ جمال اور افادے کے
اعتبار سے یہ صنف ادب دوسری اصناف پر
وجوہ فضیلت رکھتی ہے۔

گزشتہ پندرہ بیس برس کے اندر اُردو میں
فسانے کو حیرت انگیز فروغ حاصل ہوا ہے اور
بلا مبالغہ ہزاروں اچھے فسانے لکھے گئے ہیں۔ ہمارے
بعض نوجوان افسانہ نگار اپنے تخلیقی فن کے اعتبار
سے دنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ قوموں کے افسانہ

Taj Tahir Foundation

نگاروں سے لگاؔ کھانے لگے ہیں۔ چونکہ مختصر افسانہ مغرب کی پیداوار ہے اور مغربی اقوام نے اس پر محنت بھی زیادہ کی ہے۔ اس لئے ان کا کامیاب مقابلہ کرنا تو دشوار ہے۔ لیکن ایشیا میں چند چینی فسانہ نگاروں کے سوا کسی ملک کے فسانہ نگار اردو کے فسانہ نگاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہمارے نوجوانوں کا یہ شوق قائم رہا۔ اور انھوں نے اپنی تخلیقات کو زندگی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرنے میں پوری محنت سے کام کیا تو مستقبل قریب ہی میں اردو افسانہ دنیا کی ادبیات میں بہت ممتاز مقام حاصل کر لے گا۔ اور ہمارے افسانہ نگاروں کی تصنیفات نہایت قدر و عزت کے ساتھ مغربی زبانوں میں منتقل کی جائیں گی۔

Taj Tahir Foundation

ملک مقبول الٰہی ہمارے اُن ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے بہت چھوٹی عمر میں فسانے اور شعر کی طرف توجہ کی ہے۔ اور روز بروز بہتر تخلیقات پیدا کر کے پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا ہے۔ ان کے موضوع زندگی کے عام موضوع ہیں۔ وہ کسی غیر معمولی پلاٹ یا صورت حالات کی ایجاد کا تکلّف نہیں کرتے۔ بلکہ زندگی کے عام واقعات ہی میں اپنے موضوع تلاش کرتے ہیں۔ اور نہایت سادگی اور سلاست کے ساتھ انہیں افسانے کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ ان کے ادب کا حُسن سادگی ہے۔ اور وہ انتہائی بے تکلفی سے ایسی صورتیں پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ کہ لکھنے والے کا مقصد بالکل آئینہ ہو جاتا ہے

Taj Tahir Foundation

بلکہ قلب و ذہن پر اس کے اثرات نہایت آسانی سے مرتسم ہو جاتے ہیں۔ غالباً یہ خلوصِ احساس کا نتیجہ ہے۔ اور خلوص وہ شے ہے۔ جو ادیب کو دیکھتے دیکھتے کہیں کا کہیں پہنچا دیتی ہے۔

ایک اور بات مقبول کے افسانوں میں قابلِ ذکر ہے کہ وہ آج کل کے بعض انشا پردازوں کی طرح جنسیات کی دلکشی پر تکیہ نہیں کرتے۔ اور ابتذال سے اپنا دامن بچا کر چلتے ہیں۔ یہ نہایت اُمید افزا خصوصیت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ مقبول صاحب اس کو قائم رکھیں گے۔ اور کوئی چیز انہیں اس سیدھے راستے سے بھٹکنے پر مجبور نہ کرے گی۔ ادب کی پاکیزگی کو قائم رکھنا ہر ادیب کا فرض ہے۔ ورنہ ادب

اور فحش نگاری میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔

چونکہ مقبول کا فن ابھی اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہا ہے اس لئے نقادوں کو اس میں بعض تسامحات نظر آئیں گے۔ لیکن بالغ نظر اور حوصلہ افزا نقادوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ ان تسامحات سے قطع نظر کر کے افسانہ نگار کے عمومی رجحان اور اس کے نصب العین کا پتہ چلاتے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ چند ہی سال کی مشق سے وہ اپنے فن کے اوجِ کمال تک پہنچ جائے گا۔ اور اس کا ادب زبان اور انشاپردازی کو زیادہ ثروت مند بنانے کے علاوہ مسائل زندگی پر مفید و موثر تبصرہ بھی کر سکے گا۔

Taj Tahir Foundation

اب تک مقبولؔ کے افسانے صرف بعض اخباروں
اور رسالوں ہی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ
ان کے چند ایسے ہی افسانوں کا مجموعہ ہے جو
بعض احباب کے مشورے سے مرتب کیا گیا ہے۔
میں اس مجموعے کو پڑھنے والوں کی خدمت میں
پیش کرتا ہوں۔ اور امید رکھتا ہوں۔ کہ مقبولؔ
کے آئندہ مجموعے اس پہلے مجموعے سے بہت
زیادہ دلفریب اور مفید ادب پیش کریں گے۔

کراچی
۲۸ر نومبر ۱۹۵۳ء

عبدالمجید سالک

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

شکست

مکیش سکول چھوڑ کر آج پہلی مرتبہ کالج میں آیا تھا۔ سکول کی گھٹی گھٹی فضا سے اس کا دل اور دماغ دونوں گھٹ کر رہ گئے تھے لیکن آج کالج کا وسیع ماحول اسے ایک عجیب قسم کی فرحت دے رہا تھا۔ وہ یوں محسوس کرتا تھا۔ جیسے اسے کڑی قید سے نجات مل گئی ہو۔ اب وہ آزاد تھا۔ کالج ہال کے سامنے والی سڑک سے گزر کر وہ لان میں آیا۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔ آسمان پہ ہلکے پھلکے بادلوں سے دھوپ چھن چھن کر پھولوں کی رنگین کیاریوں پر پڑ رہی تھی۔ کبھی ہلکی ہوا کے جھونکوں سے پودوں کی ننھی ننھی ڈالیاں لہرانے لگتیں۔ تو کبھی اونچے درختوں کی موٹی موٹی شاخیں قدرتی ساز بجانا شروع کر دیتیں۔

موسم کے اعتدال نے ہر چیز کو ایک نیا حسن بخش دیا تھا۔ مکیش تھوڑی دیر لان میں بیٹھ کر کالج ہال میں آ گیا۔ ہال کی بلند دیواروں پہ دنیا کی مشہور ہستیوں کی تصویریں آویزاں

تھیں۔ وہ دیر تک ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک لہر ہے جو اپنی ترنگ میں سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کا جائزہ لینے کے لئے ادھر ادھر گھوم رہی ہو، اتنے میں اسے ایک قہقہہ کی آواز سنائی دی ——— ایک دل خوش قہقہہ! مکیش کے ہنستے ہوئے چہرے پر ایک دم متانت طاری ہو گئی۔ جیسے ایک بہت بڑی چٹان لہر کے راستے میں حائل ہو گئی ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکی بڑی حقارت آمیز ہنسی ہنس رہی تھی۔ وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو "کتنی بدتمیز ہے تو!" اتنے میں ایک اور لڑکی نے آواز کسا، "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" اس کے بعد سب لڑکیوں نے مل کر قہقہہ لگا۔ اور لہراتی ہوئی چل دیں۔

مکیش ایک سکتے کے عالم میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کا پیچھا کرے۔ ان سے پوچھے کہ انہیں کیا حق حاصل تھا۔ کہ وہ اس کا مذاق اڑائیں۔ وہ انہیں خیالات میں محو کھڑا تھا کہ گھنٹی بجی۔ وہ ایک دم چونکا۔ اور کتابوں کو بغل میں سنبھالتے ہوئے کلاس میں چلا گیا۔ کالج سے چھٹی ملی تو گھر آیا۔ اب وہ کچھ پریشان سا تھا۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ کتابوں کو الماری میں پھینکا۔ اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب کالج کی کوئی بات اس کے دماغ میں نہ تھی۔ رہ رہ کر اس کے کانوں میں ایک ہی فقرہ گونج رہا تھا۔ "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی"

Taj Tahir Foundation

اسی عالم میں اس نے اپنا سر میز پر رکھ دیا۔ اور سو گیا۔ شام کے سات بجے تک یونہی سوتا رہا۔ سات بجے کے قریب کمل آیا۔ کمل میٹرک تک اس کے ساتھ پڑھتا رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس نے پڑھائی ترک کر دی تھی۔ وہ دونوں گہرے دوست تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی۔ کمل اکثر مکیش کے ہاں آیا کرتا تھا۔ آج حسب معمول جب وہ آیا تو مکیش کو کمرے میں سوتا ہوا پایا۔ قریب آ کر اسے جھنجھوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

کمل ۔ خیر تو ہے۔ آج اس وقت تک سو رہے ہو؟

——— ہاں ابھی کوئی خاص بات نہیں۔ یونہی ذرا بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی۔

اس کے بعد مکیش کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کمل پاس بیٹھا ایک کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا۔"

کچھ دیر بعد کمل پھر بولا۔

"کیا بات ہے کچھ بدلے بدلے ہوئے نظر آتے ہو"؟

مکیش ۔ "ہوں"

کمل ۔ "کس سوچ میں ہو؟"

مکیش ۔ "یار کچھ عجیب خواب دیکھا ہے میں نے"

کمل ۔ "کیسا خواب؟ میں بھی تو سنوں"

Taj Tahir Foundation

کیش ۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک نہایت پرفضا باغ ہے۔ طرح طرح کے پھول کھل رہے ہیں۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک صاف وشفاف نہر بہتی ہے جس میں دودھ سے زیادہ سفید بطخیں تیرتی پھرتی ہیں۔ جابجا فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ بہت سے لوگ چہل قدمی کے لئے ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے باغ میں خوب گہما گہمی ہے۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر جوڑے ہیں یعنی ایک مرد اور ایک عورت۔ وہ سب اپنے اپنے ساتھی سے ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ اور باغ کے پرلطف ماحول سے محظوظ ہونے کے لئے ایک فوارے کے قریب کھڑا ہوں۔ اتنے میں ایک لڑکی بڑی تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتے میرے پاس سے گزری۔ اس کا کندھا میرے کندھے سے چھوا۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ اور پھر بولی۔ کتنے بھدے ہو؟ یہاں کیوں آ گئے؟ جانتے نہیں۔ یہاں بدصورت لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں"۔

میں ۔ لیکن خوب صورتی تو دل سے ہوا کرتی ہے کیا ہوا جو بدصورت ہوں۔ دل تو برا نہیں؟

لڑکی ۔ یہاں دل کو کوئی نہیں پوچھتا۔ سب ظاہری حسن پر مرتے ہیں۔ خیر چاہتے ہو تو یہاں سے چلتے بنو ———

Taj Tahir Foundation

میں بھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ تم نے آ جگایا۔

کمل :- بھئی ظلم کیا میں نے تم پہ۔ کیا معلوم تم اسے رحم کرہی لیتے

مکیش :- چھوڑ دیار اس مذاق کو۔ میں تو کچھ سہم سا گیا ہوں۔

کمل :- عجیب قسم کے وہمی ہو گئے ہو۔ اٹھو یہاں سے اندھیرے میں پڑے پڑے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ کمل نے مکیش کو زبردستی وہاں سے اٹھایا۔ اور کہیں گھومنے کیلئے لے گیا۔

مکیش کو کالج میں داخل ہوئے تقریباً سات مہینے گزر چکے تھے وہ ایک محنتی اور ہونہار لڑکا تھا۔ جلد ہی کلاس کے چوٹی کے لڑکوں میں شمار ہونے لگا۔ اس کے ہم جماعت اس کی عزت کرتے اور پروفیسر اسے شفقت کی نگاہ سے دیکھتے۔ وہ تنہائی پسند تھا۔ اس لئے لڑکوں کی محفلوں میں نہ بیٹھتا۔ کالج کے دوسرے لڑکوں کی طرح اس میں شوخی اور شرارت بھی نام کو نہ تھی۔ وہ خاموشی سے کالج میں آتا۔ اور پڑھائی کے گھنٹوں کو ختم کرنے کے بعد گھر چلا جاتا۔

اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مکیش کلاس میں دیر سے پہنچا۔ تمام بنچ بھرے ہوئے ہوتے۔ اس لئے اسے مجبوراً اس بنچ پر بیٹھنا پڑ جاتا۔ جس پر لڑکیاں بیٹھی ہوتیں۔ جب وہ مکیش کو اپنے پاس بیٹھا دیکھتیں۔ تو آہستہ سے اس بنچ سے اٹھتیں۔ اور دوسرے بنچ پر جا بیٹھتیں۔ چونکہ اس بنچ پر پہلے ہی بہت سے لڑکے لڑکیاں بیٹھے ہوتے تھے۔ اس کے آجانے سے انہیں تکلیف ہوتی۔ اور کلاس کے ضبط میں فرق آجاتا۔ اور پروفیسر کو اپنے لیکچر سے توجہ ہٹا کر

ان لڑکے لڑکیوں کی طرف متوجہ ہونا پڑتی تھیں اس کو بڑی طرح گھورتے۔ شرم کے مارے اس کی آنکھیں جھک جاتیں۔ اس طرح وہ لاشعوری دل میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ادنیٰ اور کمتر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہی احساس کمتری تھا جس نے اسے تنہائی پسند اور خاموش طبع بنا دیا تھا۔

مکیش کی زندگی کے تین سال اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میں اس نے کئی امتحان دیئے اور ترقی کرتا ہوا بی۔ اے۔ کی میں داخل ہو گیا۔

کالج میں سالانہ تقاریر کا مقابلہ تھا مکیش اپنی کلاس کی طرف سے منتخب ہوا۔ اس لئے اسے بھی اس مقابلہ میں حصہ لینا پڑا تھا۔

کالج کی وسیع گراؤنڈ میں ایک بہت بڑا شامیانہ نصب کر دیا گیا تھا۔ وقت مقررہ پر تمام لڑکے شامیانے کے نیچے جمع ہو گئے۔ شہر کے معززین بھی سب کے سب آچکے تھے، جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ شروع شروع میں لڑکوں میں بہت گرمجوشی تھی جو لڑکے اچھے مقرر تھے، انہیں خوب داد دی گئی۔ لیکن جو اس فن سے واقف نہ تھے، ان کی درگت بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ طرح طرح کی بولیاں بولی گئیں۔ ایک طرف سے سیٹیاں بجتی تھیں۔ تو دوسری طرف کئی لڑکے ایک ساتھ چھینکیں لیتے تھے غرضیکہ جو حربہ بھی کسی کو بدحواس

کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا کیا گیا۔

لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جب ایک ہی موضوع پر بار بار مختلف تقریریں کی گئیں۔ تو لڑکوں کا جوش دھیما پڑ گیا۔ ان کی توجہ مقررین کی طرف سے ہٹ گئی۔ اور تمام لڑکے کانا پھوسی کرنے لگے۔ ججوں کی حالت تو قابل رحم تھی۔ بیچارے نہ تو جلسے کو چھوڑ کر ہی جا سکتے تھے۔ کیونکہ فیصلہ کرنا تھا۔ اور نہ ہی وہاں چین سے بیٹھ سکتے تھے۔ کہ تقریروں میں اب ان کی دلچسپی کے لیے کوئی چیز نہ رہی تھی۔ پورے دو گھنٹہ تک تقریریں ہوا کیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر مقررین کا سلسلہ ختم ہوا۔

تقریروں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی سامعین میں پھر سے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ لڑکوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔

ایک لڑکا :- اس دفعہ پہلا انعام تو تکیش کو ملے گا۔ بہت اچھی تقریر کی ہے اس نے)

دوسرا لڑکا :- ہاں میرا بھی یہی خیال ہے تمام مجمع پر چھا گیا تھا۔

پہلا لڑکا :- اچھا ! دیکھو صاحب صدر کچھ کہنے کیلئے کھڑے ہوئے ہیں۔

: حضرات ! ججوں کے فیصلے مجھے مل چکے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ ایک ہی لڑکے کو متفقہ طور پر تمام ججوں نے اول قرار دیا ہے۔ میری ذاتی رائے بھی یہی ہے۔

اور اگر جج صاحبان اسے اوّل انعام نہ بھی دیتے تو میرے نزدیک صرف یہی لڑکا انعام کا مستحق ہوتا۔"

(لڑکوں کا اضطراب اور بھی بڑھ گیا)

"شاید آپ اس کا نام سننے کے لئے بہت بے چین ہوں۔ سنئے! وہ مکیش صاحب ہیں ——— تالیاں ———

"دوسرا انعام سوشیلا دیوی کو دیا جاتا ہے" ——— "پھر تالیاں"

انعامات تقسیم ہو چکنے کے بعد جلسے کی کارروائی ختم ہوئی تو سوشیلا مکیش کے پاس آئی۔ اور

"میرا نام سوشیلا ہے۔ اور میں تھرڈ ایئر آرٹس میں پڑھتی ہوں۔"

مکیش:۔ "اب بھی آپ اپنے آپ کو کسی تعارف کا محتاج سمجھتی ہیں۔"

سوشیلا:۔ "خیر یہ بات تو نہیں؟"

مکیش:۔ "میں اپنا نام کیا عرض کروں۔ آپ واقف ہی ہوں گی میں بھی تھرڈ ایئر میں پڑھتا ہوں۔ لیکن میرے مضمون آرٹس نہیں، نان میڈیکل ہیں۔"

سوشیلا:۔ "جب ہی تو میرا آپ کا کبھی میل نہیں ہوا۔"

مکیش:۔ "جی ہاں"

سوشیلا :- "اب تو آپ ملا کیجئے گا نا۔ میں ہوسٹل میں رہتی ہوں کمرے کا نمبر ۲۱ ہے

اتنے میں وہ کالج کے پھاٹک تک پہنچ گئے۔"

مکیش :- اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔

سوشیلا :- "دیکھئے بھولئے گا نہیں۔ ضرور آیئے گا میرے کمرے کا نمبر ــــــــ"

مکیش :- "(بات کاٹ کر) جی ہاں اکیس ہے۔"

مکیش کو آج پہلی مرتبہ زندگی میں حرارت محسوس ہوئی تھی۔ تنہائی اور خاموشی سے وہ سکڑ سمٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے اپنی زندگی بے کیف اور اداس اداس معلوم ہوتی تھی لیکن آج اسے یہ اداسی کسی حد تک زندگی کی رنگینی میں تبدیل ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ناچے اور خوشی سے شور مچائے۔

مکیش کی زندگی میں آہستہ آہستہ ایک عجیب انقلاب آنا شروع ہوا۔ اس نے کالج کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اب وہ لڑکیوں سے ملنے سے کتراتا نہیں تھا۔ بلکہ کبھی کبھی ان کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیاں بھی کر لیا کرتا۔ کالج کے ہر شعبہ میں اسے ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے باوجود اس میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔

وہ لڑکوں سے نہایت خندہ پیشانی اور گرمجوشی سے ملتا۔ قابلیت اور انکسار جب ملتے ہیں۔ تو عزت انسان کے قدم چومتی ہے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ مکیش کی

Taj Tahir Foundation

ہر دلعزیزی دن بدن بڑھنے لگی۔ لڑکے اس کی دل سے عزت کرتے۔ اور اس کو اپنا محسن سمجھتے۔ وہی گنیش جو ہر وقت آزردہ خاطر اور پریشان رہا کرتا تھا۔ زندہ دلی اور مسرت کا مجسمہ بن گیا۔

ایک دن جب گنیش پریکٹیکل کرنے کے بعد تھکا ماندہ لیباریٹری سے باہر نکلا۔ تو سوشیلا وہاں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔

"گنیش بابو"

گنیش بابا نے مڑ کر دیکھا۔

"اوہ۔ آپ"

"خوب وعدے کر کے چکتے ہیں آپ"

"معاف کیجئے گا۔ ان دنوں بے حد مصروف رہا۔ ورنہ ضرور حاضر ہوتا"

سوشیلا:۔ "چلئے اب ہی چلئے۔ چلئے"

گنیش:۔ "نہیں اس وقت تو میں بہت تھکا ہوا ہوں"

سوشیلا:۔ "ہوسٹل کچھ دور نہیں، وہ سامنے ہی تو ہے۔ تھوڑی دیر چائے پیجئے۔ پھر تھکن جاتی رہے گا"

گنیش:۔ آپ خواہ مخواہ تکلیف فرما رہی ہیں۔

سوشیلا:- "اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے۔ تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بھی تو بیٹھئے، کچھ وقت باتیں ہی رہیں گی۔"

مکیش:- "اچھا صاحب چلئے"!

سوشیلا مکیش کو گھر سے ڈرائینگ روم میں لے گئی۔ اور اس دن دونوں نے مل کر چائے پی، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد مکیش اٹھا اور گھڑی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"اُف اوہ پانچ بج گئے۔ مجھے تو آج پروفیسر ترپاٹھی سے ملنا تھا۔"

سوشیلا:- "یہ پروفیسر ترپاٹھی کون ہیں؟"

مکیش:- "واہ صاحب آپ نہیں جانتیں۔ فزکس ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں۔ بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔"

اچھا اب میں چلتا ہوں ———— نمستے۔

سوشیلا:- "نمستے! کبھی کبھی آ جایا کیجئے۔ ذرا گھوم ہی آیا کریں گے۔"

مکیش:- "ہاں! ہاں!! ضرور۔"

دراصل سوشیلا کے دل پر مکیش کی قابلیت اور حسن اخلاق کا سکہ بیٹھ گیا تھا۔ اور وہ اسے صرف اپنا دوست ہی بنانا چاہتی تھی لیکن مکیش کی زندگی پر اس چیز نے کسی اور طریقے سے اثر کیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ کہ سوشیلا کو اس سے

محبت ہے۔ یہ جذبہ ابھی کچھ ابھرا نہیں تھا تاہم اندر ہی اندر اس نے مکیش کے احساس کمتری کو گھٹانا شروع کر دیا تھا۔

مکیش کا اب یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ ہفتہ میں دو تین دفعہ سوشیلا کے پاس آتا۔ اور وہ دونوں سیر کرنے کے لئے کہیں باہر نکل جاتے۔ وہ اکثر پالٹکس پر بات چیت کیا کرتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا۔ کہ بات چیت بحث کی صورت میں بدل جاتی۔ اور مکیش کو کافی رات گئے تک سوشیلا کے ساتھ رہنا پڑتا۔

مکیش کی زندگی میں سوشیلا نے ایک نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی۔ وہ سوشیلا کو اپنا سچا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتا۔ جب کبھی فرصت کا وقت ملتا وہ ہوسٹل میں آ جاتا۔ اور کئی کئی گھنٹے وہیں گزار دیتا۔ اس طرح ان پر دن گزرتے گئے حتیٰ کہ امتحان سر پر آ گیا۔ امتحان شروع ہونے میں ابھی پندرہ دن رہتے تھے۔ کہ ایک شام سوشیلا خوشی خوشی مکیش کے پاس آئی وہ اسے سیڑھیوں ہی پر مل گیا۔

مکیش: "آج آپ ادھر کہاں؟"

سوشیلا: "ایک خوشخبری سنانے آئی تھی"

مکیش: "اچھا یہ بات ہے۔ تو پھر دیر کاہے کی۔ سنا ڈالیئے نا"

سوشیلا: "پہلے آپ یہ بتائیں کہ بن سنور کر آپ جا کہاں رہے تھے؟"

Taj Tahir Foundation

مکیش :"آپ ہی کی طرف جا رہا تھا۔"

سوشیلا :"تو چلیئے گھوم آئیں۔ راستے ہی میں سناؤں گی خوشخبری۔"

وہ ابھی گھر سے تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ مکیش نے کہا

"سنائیے نا وہ خوشخبری"

سوشیلا :"ہاں۔ ہاں سناتی ہوں۔"

سوشیلا نے اپنے بٹوے سے ایک فوٹو نکالا اور مکیش کو دیتے ہوئے کہا۔

"لیجئے"

مکیش نے فوٹو کو غور سے دیکھا اور کہا "کون ہیں یہ صاحب؟"

سوشیلا :"یہ ہیں۔ ایس۔ ایل کپور، فوج میں لفٹننٹ کرنل ہیں۔"

مکیش :"ہوں گے۔ کوئی خاص بات ہے جو مجھے دکھا رہی ہیں آپ"؟

سوشیلا :"پسند ہیں آپ کو"؟

مکیش :"میں انہیں پسند کر کے کیا کروں گا"۔

سوشیلا :"آپ نہیں سمجھیں گے، دیکھئے صاحب، پتاجی نے مجھے خط لکھا ہے کہ جلدی گھر آجاؤ۔ تمہاری منگنی کر دی جائے۔"

مکیش :"ایک دم منگنی!"

مکیش کو یوں محسوس ہوا جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

سوشیلا: "آپ بھی چلیں گے نا میرے ساتھ؟"

مکیش:۔ (طنزاً) "میں بھی چلوں؟"

سوشیلا:۔ "ہاں۔ ہاں یہی تو میں کہہ رہی ہوں!"

مکیش:۔ (ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ جس میں حسرت اور بے بسی کے جذبات ملے ہوتے ہوں) "میں اپنی تمناؤں کی ارتھی وہاں لے جا کر کیا کروں گا۔" یہ کہتے ہی مکیش کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔

سوشیلا: "آپ تو رونے لگے!"

مکیش: "معاف کرنا سوشیلا! مجھے ایک نہایت اندوہناک واقعہ یاد آگیا، کہ رونے لگا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کو اتنا خوبصورت پتی مل رہا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد مکیش نے سوشیلا کو واپس چلنے کے لئے کہا۔ چنانچہ سوشیلا تو ہوسٹل میں چلی گئی۔ اور مکیش نہایت پژمردگی کی حالت میں گھر پہنچا۔

اس واقعہ نے مکیش کے دل پر گہرا گھاؤ لگایا۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ مغموم ہو کر رہ گیا۔

سوشیلا اس کی زندگی میں چراغ راہ بن کر آئی تھی۔ لیکن راستے کا چھلاوہ بن کر رہ گئی۔ وہ اکثر سوچا کرتا: زندگی کی راہ اتنی آسان تو نہ تھی۔ کہ اس نے آن کی آن میں مجھ سے کنارہ کشی اختیار

Taj Tahir Foundation

کر لی۔ اگر اسے یوں ہی چھوڑ جانا تھا۔ تو مجھے اپنا ساتھی کیوں بنایا۔ وہ دھوکے باز تھی۔ اس نے مجھے فریب دیا" لیکن پھر اسے اندر ہی سے آواز آئی: "پگلے اس نے تجھے دھوکہ نہیں دیا۔ تو خود ہی غلط فہمی کا شکار ہوا۔ تو اسے چاہتا تھا۔ لیکن یہ کیا ضرور تھا کہ وہ بھی تجھے چاہتی۔ اگر خزاں بہار سے محبت کرنے لگے۔ تو یہ ضروری نہیں کہ بہار بھی خزاں کو چاہنے لگے تو نے اپنے سے زیادہ قیمتی چیز کو اپنانا چاہا۔ یہ تیری اپنی خطا تھی۔ تو اس قابل ہی کب تھا۔ کہ کوئی تجھ سے محبت کرے۔ اس میں کسی کی کوئی خطا نہیں۔ کسی نے تجھے فریب نہیں دیا۔ بلکہ تو خود ہی دھوکہ کھا گیا ——"

زندگی بہر حال کاٹنی تھی۔ دل بہلانے کے لئے کچھ تو چاہیے تھا۔ بے چارہ کلیش اپنے دل کو اسی طرح تسکین دے لیا کرتا۔ کہ اس کی زندگی میں تھوڑی دیر کے لئے بہار آئی تھی۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے سمجھا بہار آئی ہے تو میرے باغ تمنا میں گل مراد بھی کھلیں گے۔

لیکن آہ! غریب کو کیا خبر تھی کہ خزاں ہی بہار کا بھیس بدل کر نمودار ہو گئی تھی۔ بہار کا چوغہ اترتے ہی اس نے خزاں کا ہولناک اور تباہ کن چہرہ دیکھا۔ اس کی رہی سہی خوشیاں بھی ملیامیٹ ہو گئیں۔

اب کلیش نے تمام تفریحات کو اپنے لئے گویا حرام کر لیا۔ وہ یا تو لیبارٹری میں سائنس کے تلخ تجربات کرتا رہتا۔ یا اپنے کمرے میں بند سائنس کی مشکل کتب کے مطالعہ

Taj Tahir Foundation

میں غرق رہتا۔ اس محنت اور مشغولیت نے اس کی ذہنی الجھن کو کافی حد تک کم کر دیا تھا اور وہ جوں توں کر کے زندگی کے دن کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔

کلکتہ مرے کالج کے سامنے ایک کار رکی۔ دروازہ کھلا۔ اور اس میں سے ایک آدمی نکلا۔ چھوٹا سا قد، نہایت پتلا، دبلا، سر پہ لمبے لمبے بال، گال پچکے ہوئے، رنگ گندمی۔ مگر محنت کی زیادتی کی وجہ سے زرد پڑ چکا تھا۔ یہ ہے کون؟ قریب چل کر دیکھئے۔ اوہ! یاد آیا۔ یہ تو ڈاکٹر کیشن ہیں۔ اس کالج میں سائنس ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں۔ جدھر سے گذر جاتے ہیں لڑکے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ یہ شاید ان کے خلوص اور شفقت کا نتیجہ ہے ورنہ آج کل لڑکوں میں یہ تپاک کہاں؟

ڈاکٹر کو کالج میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس کی ان تھک کوشش اور محنت سے سائنس ڈیپارٹمنٹ کی کایا پلٹ گئی تھی۔ وہ کالج کی دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے سے گریز نہ کرتا۔ علاوہ ازیں شہر کے دوسرے لوگ اکثر اس کے پاس کسی نہ کسی جلسہ کی صدارت پیش کرنے کے لئے آتے رہتے۔ وہ ان سب سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ اور باوجود اپنی کم فرصتی کے ان کی درخواست کو کبھی رد نہ کرتا۔

کیشن، ماضی کی کرخت یاد کو بھول کر کالج کی مشغولیت سے بھرپور زندگی میں کھو چکا تھا۔ اس دوران میں اس نے کئی کتابیں لکھیں۔ جو سب کی سب مقبول ہوئیں۔ لیکن اس کی

Taj Tahir Foundation

نئی کتاب جو بانٹی کے موضوع پر لکھی گئی تھی۔ اتنی ہر دلعزیز ہوئی۔ کہ اسے بیسیوں روزانہ ایسے خطوط موصول ہوتے جن میں اس کتاب کے لکھنے پر مبارک باد دی جاتی۔

ایک دن جب ڈاکٹر کالج سے تھکا ماندہ گھر لوٹا تو میز پر ڈاک پڑی تھی۔ سب سے پہلے اسی کو دیکھنا شروع کیا۔ پہلا خط اٹھایا۔ لفافے کو پھاڑا اور خط پڑھنا شروع کیا۔

از الہ آباد

۱۸ر جولائی سنہ ۱۹ء

محترمی ڈاکٹر صاحب!

آپ کی کتاب میں نے پڑھی۔ کتنی اچھی ہے! الفاظ تعریف کرنے سے قاصر ہیں۔ تعجب ہے۔ کہ اتنے خشک اور ٹھوس موضوع پر لکھی ہوئی کتاب اتنی دلچسپ اور مزے دار ہے۔ میں نے کئی دفعہ اسے پڑھا۔ لیکن ہر بار ایک نیا لطف ملا۔

جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ میرے لئے مقدس بنتی جا رہی ہے دن میں ایک بار جب تک اسے اچھی طرح دیکھ نہ لوں چین نہیں پڑتا۔ . . . . . . آپ نہیں سمجھ سکتے۔ میرے دل میں آپ کی کتنی عزت ہے۔ آپ میرے دیوتا ہیں۔ جب کبھی آپ کا تصور کرتی ہوں۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں

ادھر میں نے ناحق آپ کو پریشان کیا۔ مگر کیا کرتی۔ دل کے ہاتھوں مجبور

Taj Tahir Foundation

تھی۔ خط لکھتے ہی بنی۔

فقط آپ کی

کامنی

الہ آباد کالج فار وومین

خط ختم ہوتے ہی ڈاکٹر نیم مدہوشی کی حالت میں آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ پل کی پل میں گذشتہ زندگی کے تمام واقعات اس کے سامنے سے ہو کر گزر گئے۔ اسے یوں احساس ہوا۔ جیسے زخم دل پھر سے ہرے ہو رہے ہیں۔ وہ بڑی تیزی سے کرسی سے اٹھا اور خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے۔

کامنی نے کئی خط بھیجے۔ لیکن ڈاکٹر نے کسی ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ جتنے خط آتے۔ وہ انہیں پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتا۔ وہ زندگی میں ایک بار پہلے بھی دھوکہ کھا چکا تھا۔ اب دوبارہ وہ اس حسین فریب میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس نے عہد کر لیا تھا۔ کہ وہ اپنی تمام زندگی اکیلے ہی گزار دے گا۔

لیکن اب کی بار ایک ایسا خط آیا۔ جس کا جواب ڈاکٹر کو دیتے ہی بنی۔ خط کچھ یوں شروع ہوتا تھا۔

میرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوست !

خط لکھتے تھک گئی۔ مگر جواب نہ آیا۔ ہر وقت ڈاکیہ کی راہ دیکھا کرتی ہوں ڈاک ملتی ہے۔ تو آپ کا خط ڈھونڈتی ہوں۔ لیکن مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

آخر گھلا گھلا کر مارنے سے کیا فائدہ؟ دو حروف لکھ دینے میں آپ کا حرج ہی کیا ہے؟ کیا میں عمر بھر کے لئے ناامید ہو جاؤں؟

یہ خط میں آپ کو آخری بار بھیج رہی ہوں، پانچ دن تک انتظار کروں گی۔ اگر جواب نہ آیا تو اپنی زندگی ختم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہو گا۔

بدنصیب

کامنی

کمیش نے کچھ دیر غور کیا۔ اور اس کے بعد خط کا جواب لکھنا شروع کیا ——

کامنی دیوی!

معاف کیجئے گا۔ آپ میرے متعلق بہت کم جانتی ہیں۔ میری حالت اس کچھوے کی سی ہے۔ جسے ہر کوئی دھتکارتا ہو لیکن اگر کوئی اس سے ذرہ سی شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ تو اس کی باچھیں کھل جائیں۔ اسی طرح جب آپ کا محبت بھرا خط آتا ہے۔ تو میرا دل پھولے نہیں سماتا۔ مگر ساتھ ہی ایک ایسا خیال آتا ہے۔ جس سے میری تمام خوشی پر پانی پھر جاتا ہے۔ اور میں آپ کی محبت کا جواب دینے سے رک جاتا ہوں۔

Taj Tahir Foundation

ایشور کے لئے میرے حال پر رحم کیجئے۔ اور میں جیسا ہوں ویسا ہی رہنے دیجئے۔ میں آپ کے لائق نہیں۔

آپ کا خیر اندیش

مکیش

کامنی کو یہ خط ملا۔ تو اس نے فوراً مکیش کے نام ایک تار روانہ کر دیا۔ تار میں لکھا تھا۔

"میں پرسوں چار بجے کی گاڑی سے کلکتہ پہنچ رہی ہوں آپ براہ مہربانی اسٹیشن پر پہنچ جایئے۔"

مکیش یہ تار پڑھ کر نہایت پریشان ہوا۔ دل میں سوچا۔ کہ لڑکی کتنی جلد باز ہے۔ شاید اسے معلوم نہیں کہ میری زندگی دکھ اور درد کا ایک تانا ہے۔ اس میں مسرت اور راحت کا نام ونشان تک نہیں۔ لیکن پھر وہ خیال کرتا۔ کیا وہ میرے درد کا درماں نہیں بن سکتی؟ کیوں نہیں؟ اگر وہ چاہے تو مجھے ایک نئی زندگی بخش سکتی ہے۔ وہ میرے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ سکتی ہے۔ وہ چاہے تو میرا سونا سونا دل خوشیوں کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ وہ میری آشاؤں کا دیپ ایک بار پھر سے جلا سکتی ہے۔

مگر کیا وہ مجھے پسند کرے گی؟ کیا وہ مجھے اپنے دل میں جگہ دے سکے گی؟ کیا وہ میرے اداس اور پژمردہ چہرے سے خود بھی تو اداس نہ ہو جائے گی؟

Taj Tahir Foundation

انہیں خیالات میں اس نے دو دن گزار دیئے۔ اور کامنی کے آنے کا وقت بالکل قریب آ گیا۔ وہ عجیب قسم کی ذہنی کشمکش میں گرفتار تھا۔ کیا کرے کیا نہ کرے.....

گھڑیال نے چار بجائے وہ ایک دم اٹھا۔

"اس کے آنے میں صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا!"

کوٹ اٹھایا اور کوٹھی کے باہر آ کر پھر رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسٹیشن پر جائے یا نہ جائے۔ وہیں کھڑے کھڑے پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ اس نے گھڑی کو دیکھا۔

"سوا چار"

اس کے قدم خود بخود اسٹیشن کی طرف اٹھنے لگے۔ اسٹیشن کچھ دور نہیں تھا۔ دس منٹ میں کیمش اسٹیشن پہ پہنچ گیا۔ اور نہایت اضطراب میں پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

کچھ دیر بعد گاڑی آ گئی۔ مسافر گاڑی سے اترے اور ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے۔ پندرہ منٹ میں پلیٹ فارم بالکل خالی تھا۔ لیکن نہیں۔ صرف ایک عورت نہایت متجسس نگاہوں سے کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ عورت کیا تھی۔ مرقع حُسن تھی۔ اُبھرا ہوا جسم۔ بڑی بڑی آنکھیں، پتلی سی موزوں ناک، دائیں گال پر خفیف سا تل، میانہ قد، ہاتھ میں ہینڈ بیگ ——— ڈاکٹر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ہو نہ ہو یہی ہے کامنی"

اس نے آہستہ آہستہ قدم اٹھائے اور اس کے قریب آکر پوچھا۔

"آپ کسے ڈھونڈ رہی ہیں"؟

کامنی:۔ "آپ کا مطلب"!

ڈاکٹر:۔ "ڈاکٹر کمیش سے تو ملنا نہیں چاہتی ہیں آپ"؟

کامنی:۔ "آپ انہیں جانتے ہیں"؟

ڈاکٹر:۔ "(ذرا جھجکتے ہوئے) میں ہی ہوں کمیش

کامنی:۔

"آپ! . . . آپ ہیں ڈاکٹر کمیش . . . اوہ! معاف کیجئے گا۔

مجھے . . . . مجھے ایک نہایت ضروری کام کے لئے آج ہی ڈھاکہ جانا

ہے۔ آپ مجھے اپنا پتہ دے دیجئے۔ واپسی پر آپ سے ملتی جاؤں گی"۔

ڈاکٹر:۔ (نہایت بے بسی اور یاس سے بھری ہوئی آواز میں) "خیر اب چھوڑیئے

پتہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

اتنے میں سامنے سے ایک قلی گزرا، کامنی نے اسے آواز دی۔ اور سامان

اٹھانے کے لئے کہا۔

قلی:۔ "کہاں چلئے گا دیوی"؟

کامنی :۔ "لیڈیز ویٹنگ روم تک۔ کب جاتی ہے ڈھاکہ کو گاڑی"؟

قلی! "حضور ساڑھے پانچ بجے"۔

"اچھا چلو"۔

ڈاکٹر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے تمام دنیا چل رہی ہو۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ قریب تھا۔ کہ تیورا کر گر پڑے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مشکل اسٹیشن سے باہر آیا۔ ایک ٹیکسی لی اور گھر آگیا۔ پلنگ پر لیٹ کر خوب رو دیا۔ اور نہ جانے روتے روتے کب سو گیا۔ تین بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ اس کا دماغ کچھ ہلکا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ میز پر کھانا رکھا ہوا تھا۔ اور پاس نوکر دیوار سے ٹیک لگائے خراٹے لے رہا تھا۔

اچانک اس کی نظر آئینہ پر پڑی۔ وہ قریب گیا اور جی بھر کر اپنی شکل کو دیکھا۔

"یہ میں ہوں؟ اتنا خوب صورت"!

"لیکن لوگ مجھے بدصورت کیوں سمجھتے ہیں؟ یہ اندھے ہیں۔ یہ کیا جانیں خوبصورتی کو ——— یہ تو اس کو بدصورتی سمجھتے ہیں"۔

"تو پھر میں یہاں کیوں رہوں"؟

"میں جاؤں گا ———"

اس جگہ جہاں کوئی میری خوبصورتی کی قدر کر سکے۔ میں ان بے رحم انسانوں کی بستی میں نہیں رہنا چاہتا۔ جو فقط ظاہری حسن پر مرتے ہیں۔ اور حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اب میں اپنی زندگی وہاں گزاروں گا۔ جہاں فطرت اپنی تمام رعنائیوں سے جلوہ گر ہو۔ جہاں وہ اپنے خوبصورت نظاروں سے دل کو پاکیزگی اور اطمینان بخشے۔ جہاں اس کے پیدا کئے ہوئے معصوم اور خوش الحان پرندے میرے ساتھ مل کر اس کی مدح کیا کریں۔ میں ان کا ہمدرد ہوں اور وہ میرے دکھ درد میں شریک ہوں۔

کلکتہ سے کچھ میل دور جہاں پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ آدھی رات کے وقت کوئی نہایت دردناک آواز میں گاتا ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں۔ مدت ہوئی انہیں پہاڑیوں میں ایک سادھو رہا کرتا تھا۔ اس کی آواز میں بلا کی کشش تھی جب وہ گاتا تمام چرند پرند اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے۔ لوگوں کا خیال ہے۔ اس کا دل کسی نازنین نے توڑ دیا تھا۔ اسی لئے اس کی آواز میں سوز پیدا ہو گیا۔ جو ہر ایک سننے والے کے دل کو رلا دیتا۔ وہ یہیں مر گیا۔ اور یہ اسی شکستہ دل سادھو کی بے چین روح ہے جو ہر رات دنیا والوں کی سنگدلی کی داستان ایک دردناک لے میں سناتی رہتی ہے ٭

تلافی

سینما کی گھنٹی بجی دروازوں پر سے پردے گرے، بجلیاں بجھ گئیں اور پردہ سکرین پر یکے بعد دیگرے اشتہارات آنے لگے۔ لوگ اپنی چہ میگوئیاں چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ یکایک ایک شور اٹھا۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے ہر ایک نے متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ کئی من چلے اپنی سیٹیوں کو چھوڑ، دوسروں کی کرسیاں پھلانگتے ہوئے ان کی گالیاں کھاتے ہوئے اس جگہ جا پہنچے جہاں سے شور شروع ہوا تھا۔

"خدا را مجھے اندر جانے دو۔ مت روکو مجھے میں بہت دکھیا ہوں!" یہ ایک نو عمر لڑکی تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال، جن میں نہ جانے کتنے دنوں سے تیل نہیں پڑا تھا۔

Taj Tamir Foundation

گرد و غبار سے اٹے ہوئے کپڑے، چہرے پرغم اور تھکاوٹ کے گہرے نقوش، واقعی دکھیا معلوم ہوتی تھی۔

"لیکن میں تمہیں کیسے جانے دوں اندر، تمہارے پاس ٹکٹ تو ہے نہیں۔" گیٹ کیپر نے کہا۔

"کیا تم مجھے بھیک بھی نہیں دے سکتے۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں، مجھے اندر جانے دو۔"

"یوں نہیں مانے گی یہ، پگلی کہیں کی، لے چلوا سے منیجر کے پاس۔" اتنے میں اُدھر سے رشید آ نکلا۔ یہ پکچر اسی نے ڈائرکٹ کی تھی۔ چونکہ فلم پاکستان بھر میں پہلی دفعہ لگی تھی۔ اس لئے وہ لوگوں کی اس کے متعلق رائے دریافت کرنے کے لئے یہاں تک چلا آیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ لوگ ایک جگہ بھیڑ لگائے کھڑے ہیں۔ تو وہیں ٹھہر گیا۔

رشید: "کیوں بھئی کیا ہو رہا ہے یہاں" ؟

گیٹ کیپر: "یہ ایک پگلی ہے، بغیر ٹکٹ کے اندر جانا چاہتی ہے"۔

رشید: "بغیر ٹکٹ کے اندر جانا چاہتی ہے" !

اس نے چند لمحوں کے لئے لڑکی کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا کہ مصائب اور مظالم کے مہیب بادلوں کے پیچھے حسن کی پرسکون اور دلکش

Taj Tanin Foundation

وادی ہے۔ اس کی فنی نظروں نے ایک ایسی چمک دیکھی۔ جس کی شعاعیں گرد و غبار پڑ جانے کی وجہ سے اپنا اجالا نہیں پھیلا سکتیں۔ اس نے سوچا اگر میں اس کے زخمی دل پر ہمدردی اور حسن سلوک کی مرہم لگا دوں تو دکھ اور پریشانیوں کے تمام بادل چھٹ جائیں گے۔ اس کا مرجھایا ہوا حسن ایک دم نکھر آئے گا۔ اور پھر ہو سکتا ہے۔ کہ یہ لڑکی ایک دن پردۂ سکرین کی ممتاز ترین اداکارہ بن جائے۔

"اچھا کوئی بات نہیں چلو میں تمہیں اندر بٹھائے دیتا ہوں۔"

"سچ! میں آپ کا احسان تمام عمر نہ بھولوں گی۔"

"ہاں! تو بتا سکتی ہو تمہارا کیا نام ہے؟"

"کیوں نہیں! مجھے زاہدہ کہتے ہیں۔"

"زاہدہ! خوب! لو اب اندر چلو، فلم شروع ہو چکی ہے۔"

رشید یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ زاہدہ اس فلم کو دیکھنے کے لئے اتنی بے قرار کیوں تھی۔ تاہم اس نے اس کے متعلق پوچھنا غیر مناسب سمجھا۔

زاہدہ ابھی سیٹ پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ یہ سین شروع ہوا۔

ایک خوبصورت نوجوان ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے ساتھ باغیچہ میں ٹہل رہا ہے عورت میں کوئی خاص دلکشی تو نہیں۔ ہاں! اس کا حد سے بڑھا ہوا سنگھار اس کا اوچھا پن

Taj Tahir Foundation

ضرور ظاہر کر رہا تھا۔

"آج ضرور بھاگ چلو"۔

"تم جانتی ہو رتنا میں نے پہلے بھی کئی دفعہ بھاگ جانا چاہا۔ لیکن عین اس وقت وہ منحوس میرے ماتھے آگئی اور میں نہ جا سکا۔

رتنا:۔ "مگر آج تو وہ گھر میں نہیں۔ تم نے خود ہی کہا تھا۔ کہ وہ باہر کہیں خرید و فروخت کے لئے گئی ہوئی ہے۔ اس سے بہتر موقع اس ڈائن سے پیچھا چھڑانے کا اور کوئی نہیں ملے گا۔ انور۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔ اور بھاگ چلو"۔

انور:۔ "اچھا! میں چلتا ہوں"!

سین بدلتا ہے۔

ابھی رتنا اور انور گھر کے بڑے دروازے سے نکلنے نہیں پاتے کہ انہیں ایک عورت ملتی ہے۔

عورت:۔ "کہاں جا رہے ہیں آپ"؟

رتنا:۔ "میرے ساتھ جا رہے ہیں"۔

عورت:۔ کہاں؟

انور:۔ "بھاڑ میں۔ نہ جانے کون سا منحوس دن تھا کہ تو میرے پلے پڑی تھی۔

ہٹو آگے سے میں کہتا ہوں"

عورت :"مگر میں آپ کے بغیر کیسے زندہ رہ سکوں گی میرے سرتاج"؟

انور:"کون کہتا ہے تمہیں زندہ رہنے کو۔ زہر کھالو۔ یا کہیں ڈوب مرو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

وہ پاؤں پڑتی ہے۔ لیکن انور اسے ایک ہی جھٹکے سے زمین پر گرا کر تیزی سے آگے جا نکلتا ہے۔

ایک دم زاہدہ کی چیخ نکلتی ہے!

"نصیر!"

تمام لوگ چونک پڑے۔ رشید نے دیکھا کہ زاہدہ ساتھ والی کرسی پر بے ہوش پڑی ہے۔ اس نے جلدی سے دو ملازموں کو بلایا۔ اور زاہدہ کو کار میں لٹا کر اپنے گھر لے گیا۔

جب زاہدہ کو ہوش آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ رشید اس کی چارپائی کے دائیں طرف بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ وہ کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر رشید نے خود ہی اس پر نگاہ ڈالی۔

رشید :"کیسی طبیعت ہے اب"؟

زاہدہ :"میں بالکل ٹھیک ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے اٹھنا چاہا لیکن رشید نے اسے یہ کہہ کر لٹا دیا کہ اسے آرام کی بے حد ضرورت ہے۔

Taj Tahir Foundation

زاہدہ۔ میں نے آپ کو کتنی تکلیف دے رہی ہوں۔

رشید۔ ایسامت کہو۔ کسی دُکھی انسان کو سہارا دینا ہر آدمی کا فرض ہے۔ پھر اس میں تکلیف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک دو دن کے بعد زاہدہ نے رشید سے اجازت لینا چاہی۔ لیکن اس نے اُسے نہ جانے دیا۔ زاہدہ اصرار نہ کر سکی۔ رشید اس سے کتنی ہمدردی سے پیش آیا تھا۔ اس کی سچی ہمدردی اور خلوص کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نے وہاں رہنا قبول کر لیا۔

زاہدہ کو رشید کے ہاں رہتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران میں رشید نے ایک دن بھی زاہدہ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی۔ بالکل اداس، آخر ایک دن اس نے زاہدہ سے پوچھا۔

"تم ہر وقت چپ سادھے رہتی ہو، نہ ہنستی ہو، نہ کسی کام میں انہماک ہی ظاہر کرتی ہو، آخر کیا بات ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ وہ کونسی چیز ہے جس کا غم تمہیں دن رات گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے"

زاہدہ:۔ کیا پوچھ کر کریں گے آپ۔ میری مثال تو اس پرندے کی سی ہے۔ جس نے موسم خزاں میں جنم لیا ہو۔ اور جب موسم بہار آئے تو دکھ درد کے بادلوں نے اسے گھیر لیا ہو۔ مجھے تو کبھی کبھی یوں احساس ہوتا ہے کہ خوشی میری قسمت ہی میں نہیں"

رشید :- "ناامید نہیں ہونا چاہئے زاہدہ! مصائب تو انسان کی کسوٹی ہیں۔ جو لوگ اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں وہی دراصل انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔ ہمت نہ ہارو۔ اگر خدا نے چاہا تو بہت جلد تمہاری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔"

جس ماحول میں زاہدہ اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ ایک آرٹسٹ کا ماحول تھا۔ تمام گھر میں مصوری اور سنگ تراشی کے بہترین نمونے پڑے تھے، وہ گھنٹوں انہیں غور سے دیکھا کرتی اسے یوں محسوس ہوتا کہ اس میں آرٹ کو سمجھنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ آہستہ آہستہ اسے موسیقی سے بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ رشید یہ دیکھ کر خوش تھا کہ زاہدہ نے اسی راستہ پر چلنا شروع کر دیا تھا جس پر وہ اسے چلانا چاہتا تھا۔ اس کی دُور رس نگاہوں نے جن خوبیوں کو اس میں پہلے دن چھپا ہوا دیکھا تھا۔ وہ اب اُجاگر ہونے لگی تھیں۔ اس نے زاہدہ کو موسیقی سیکھنے میں پوری پوری مدد بہم پہنچائی۔ اب وہ زاہدہ پہلی سی زاہدہ نہ رہی جس کے منہ پر ذرہ ذرہ سی بات پر شرم کی وجہ سے سرخی دوڑ جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خود اعتمادی اور زندہ دلی کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

ایک دن باتوں باتوں میں رشید نے کہا: "کیا خیال ہے اگر تم فلمی لائن اختیار کر لو۔"
وہ ہنس دی اور کہنے لگی۔
"آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

Taj Tahir Foundation

رشید:۔ "مذاق کیسا۔ سچ کہتا ہوں۔ اس پروڈیوسر کے وارے نیارے ہو جائیں جس کی فلم میں تم کام کرو۔"

زاہدہ:۔ "نہیں رشید صاحب! آپ کا خیال غلط ہے، مجھ میں وہ خوبیاں کہاں جو ایک اداکارہ میں ہوتی ہیں"

رشید:۔ "تمہیں علم نہیں زاہدہ! تم میں ایکٹرس بننے کے کون کون سے گن ہیں۔ اگر تم میری بات مان جاؤ تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

زاہدہ:۔ "تو کیا؟"

رشید:۔ "لطف آجائے کام کرنے کا"

زاہدہ:۔ "اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو یونہی سہی"

زاہدہ کی فلم تیار ہو گئی، مارکیٹ میں آئی، لوگ دیوانہ وار ٹوٹ پڑے، عوام و خاص نے زاہدہ کی اداکاری کو سراہا۔ کچھ ایسی جدت تھی اس کی اداکاری میں کہ دیکھنے والے داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اب کیا تھا، اس کے چاہنے والوں کا ایک انبوہ کثیر پیدا ہو گیا ——— کوئی خط لکھ رہا ہے کہ بس زاہدہ صاحبہ، اداکاری آپ پر ختم ہے۔ اگر آپ کی تین چار فلمیں لگاتار اسی طرح آتی رہیں تو کوئی بھی کسی دوسری ایکٹرس کی فلم نہ دیکھے گا کوئی صاحب بہ نفس نفیس زاہدہ کے ہاں پہنچ جاتے اور ایک لمبا چوڑا تعارفی رقعہ بھیجتے۔ کہ

بعد اس سے ملنے کی درخواست کرتے، جو ہمیشہ رد کر دی جاتی۔ کیونکہ وہ لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتی تھی۔

اتنی بلندی پر پہنچنے کے بعد ایکٹرسیں خوشی سے پھولے نہیں سماتیں ڈائرکٹروں اور ایکٹروں کو دعوتیں دیتی ہیں۔ کلبوں میں بھڑکیلے لباس پہن کر ادھر اُدھر مٹکتی پھرتی ہیں کہ ان کے چاہنے والوں کے دل میں ان کی چاہت کی آگ بھڑک اُٹھے مگر زاہدہ کا معاملہ اس سے بالکل برعکس تھا۔ اس کی طبیعت میں وہی پہلی سی سادگی تھی۔ بلکہ اب تو وہ کچھ مغموم سی رہنے لگی تھی۔ اسے گانے کا شوق تھا۔ اس لئے وہ گاتی بھی تھی لیکن گانے کی غرض سے نہیں۔ بلکہ اپنی بھسم کر دینے والی آہوں کے غبار کو نکالنے کے لئے یہ تو ان آرزوؤں کا ماتم تھا جو پیدا ہونے سے پہلے ہی کچل دی گئی تھیں۔ رشید بعض دفعہ اس کی یہ حالت دیکھ کر نہائت بیتاب ہو جاتا۔ وہ اس سے دریافت کرتا کہ اسے کیا دکھ ہے جو ہر وقت اس کی روح اور دماغ کو پریشان کئے رکھتا ہے۔ لیکن اس کے جواب میں زاہدہ کے رخساروں پہ ہمیشہ دو سفید سفید آنسو ڈھلک آتے اور وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیتی۔ اس کے بعد رشید کی ہمت ہی نہ پڑتی۔ کہ وہ اسے اس بارے میں اور زیادہ دق کرے۔

دن یونہی گزر رہے تھے کہ ایک روز رشید جب گھر میں آیا تو اس نے دیکھا ——— زاہدہ ایک تصویر کے سامنے کھڑی باتیں کر رہی ہے، وہ غور سے سننے لگا۔

" ...... نصیر تم کتنے بے دفا نکلے۔ یاد ہے وہ دن جب میرے ماں

باپ نے مجھے گھر سے اس لئے نکال دیا تھا کہ میں تمہیں چاہتی تھی۔ لیکن میں نے اسے منظور کر لیا۔ کیوں کہ میں تمہاری جدائی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کی تمام جائداد پر میرا حق تھا۔ انہوں نے مجھے اس سے بھی عاق کر دیا۔ میں نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ سارا سارا دن گھر میں نوکروں کی طرح کام کیا۔ کئی کئی دن فاقے سہے، لیکن زبان پر حرفِ شکائت نہ لائی۔ کہ تمہیں دکھ ہوگا۔ لیکن تم نے ان سب کا بدلہ یہ دیا کہ ایک ویشیا کے بہکانے پر مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ آئے . . . . . .

مرد کتنے بے وفا ہوتے ہیں نصیر !"

رشید نے جب نصیر کا نام سنا تو ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے سینما کا واقعہ پھر گیا۔

"او یاد آیا زاہدہ کے منہ سے بے ہوش ہوتے ہوئے نصیر کا نام نکلا تھا لیکن میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ نصیر ہی تو اس فلم میں کام کرتا تھا۔ جسے دیکھتے ہوئے زاہدہ بے ہوش ہو گئی تھی . . . . . . " لیکن زاہدہ کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے ؟" رشید نے آگے بڑھ کر اس تصویر کو دیکھا جس کے سامنے زاہدہ بیٹھی اس وقت سسکیاں بھر رہی تھی، یہ نصیر ہی تھا۔

رشید چپکے سے باہر نکل گیا۔ جیسے اسے کسی چیز کا علم نہیں ہوا اور شام کو حسبِ معمول کھانے کی میز پر آ بیٹھا۔

رشید :- زاہدہ ! میں نے آج تمہاری سب باتیں سن لی ہیں۔ اب مجھے معلوم

Taj Tahir Foundation

ہوا کہ کونسی آگ میں جل رہی ہو تم "

زاہدہ نے انتہائی حیرت سے اپنا سر اٹھایا۔

"کیا معلوم ہو گیا آپ کو ؟"

رشید: یہی کہ نصیر تمہارا شوہر ہے اور اس نے محض ایک بازاری عورت کے فریب میں آ کر تم جیسی وفا شعار بیوی سے منہ موڑ لیا۔

زاہدہ: " آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ کیوں خواہ مخواہ ایک دکھیا کی بپتا میں اُلجھ گئے۔ میں تو پیدا ہی بد قسمت ہوئی ہوں۔ آپ کیوں میری وجہ سے ناحق پریشان ہوتے ہیں"

رشید: "لیکن اس کا کیا علاج زاہدہ کہ نصیر تم سے بہت دور جا چکا ہے اب اسے واپس لانا بالکل ناممکن ہے۔ ہر وقت شراب کے نشہ میں دھت رہتا ہے۔ اس نے خوشیوں سے بھرپور زندگی کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر اپنے دماغ سے اتار دیا ہے۔ دن رات اس ویشیا کے گھر پڑا رہتا ہے۔ اور وہ ڈائن اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی دولت کو پانی کی طرح ضائع کر رہی ہے "

زاہدہ: "میں ناامید نہیں ہوں۔ رشید صاحب! میرا صبر ایک دن ضرور رنگ لائے گا اور وہ اپنی غلطی پر ضرور پچھتائیں گے "!

رشید: " خدا ایسا ہی کرے زاہدہ!"

زاہدہ کی زندگی نے ایک نیا ورق الٹا۔ اس نے تنہائی کی زندگی کو خیر باد کہہ کر

Taj Tahir Foundation

نئی تہذیب میں رنگی ہوئی ایک عورت کا روپ دھار لیا۔ وہ کلبوں اور ہوٹلوں میں بے جھجکے جاتی۔ مختلف آدمیوں سے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ملتی۔ اس کی سیدھی سادھی عادتوں پر تکلف کا گہرا رنگ چڑھ آیا۔ اس کی زندگی میں حقیقت کی گہرائی نہ رہی۔ بلکہ اس کی جگہ دکھاوے کا سطحی پن آگیا ہوٹلوں کے ہال اس کے کھنکتے ہوئے نقرئی قہقہوں سے گونج اٹھتے۔ وہ نہایت ناز و انداز سے ان میں داخل ہوتی اور تہذیب کے مردار مریضوں کو اپنی شوخ اور چنچل اداؤں سے زخمی کرتی ہوئی گزر جاتی۔ لیکن یہ سب کچھ بناوٹی تھا۔ اسے اس زندگی سے سخت نفرت تھی۔ وہ جانتی تھی۔ عورت اس طرح عورت نہیں رہتی بلکہ ایک کھلونا بن جاتی ہے۔ جیسے تہذیب زدہ نفس پرست اپنی بوالہوسی کا شکار بنانے کے لئے طرح طرح کے فیشنوں سے مزین کرتے رہتے ہیں۔ مگر انہیں پھر بھی تسکین نہیں ہوتی۔ ان کی حرص تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے اور وہ اس کو پورا کرنے کے لئے ایسی ایسی راہیں اختیار کرتے ہیں۔ جو انہیں آخر کار ذلت اور پستی کے خوفناک گڑھوں میں دھکیل دیتی ہیں۔

زاہدہ نے یہ زندگی اس لئے اختیار کی تھی تاکہ وہ نصیر کو راہِ راست پر لا سکے۔ نصیر نے کئی دفعہ اسے دیکھا لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی زاہدہ ہے۔ زاہدہ بھی اسے دیکھتی لیکن نہایت بے اعتنائی سے نظریں پھیر لیتی۔ آخر نصیر سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔ ایک دن جب اس نے زاہدہ کو ایک ہوٹل میں

میز پر اکیلی بیٹھے ہوئے پایا تو اس کے قریب آ کھڑا ہو گیا اور اسے گھورنے لگا۔

زاہدہ "کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"آواز بھی زاہدہ ہی کی ہے" اس نے دل میں سوچا۔ لیکن وہ کیسے ہو سکتی ہے یہ؟"

اس کی نظروں کے سامنے دو زاہدائیں تھیں۔ ایک شرم و حیا کی پتلی دوسری بے حیائی کی تصویر۔

زاہدہ۔ جواب نہیں دیتے آپ؟ کیوں کھڑے ہیں یہاں؟"

لیکن نصیر نے جیسے سنا نہیں وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا آپ . . . ." اس کی زبان کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

زاہدہ "کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

نصیر "سچ بتائیے کیا آپ وہی زاہدہ تو" . . . . اس کے آگے وہ پھر کچھ نہ کہہ سکا۔

زاہدہ۔ "کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں آپ۔"

اتنے میں رشید وہاں آ گیا۔

"اوہ آپ آ گئے؟" زاہدہ نے نصیر سے اپنی توجہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔"

نصیر وہاں سے چلا گیا۔ وہ سخت کشمکش میں مبتلا تھا۔

نصیر تمام رات اس نئی زاہدہ کے متعلق سوچتا رہا۔ کبھی کہتا "یہ وہی زاہدہ ہے جس سے میری شادی ہوئی تھی" پھر خود ہی اس کی تردید کر دیتا۔ "وہ کیسے ہو سکتی ہے یہ —— اس میں تبدیلی ہرگز نہیں آ سکتی" پھر سوچتا۔ "ہو سکتا ہے قدرت نے بالکل اس جیسی ایک اور زاہدہ پیدا کر دی ہو۔ کچھ بھی ہو وہ زندگی کتنی خوشگوار تھی۔ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی تھی۔ جب میں دفتر سے تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو اس کی پیار بھری نظریں میری سب تھکان دور کر دیتیں۔ کتنا خیال تھا اسے میرا —— مگر میں نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی اور اس وفا کی دیوی کو کتنی بے دردی سے ٹھکرا کر چلا آیا۔

زاہدہ کو غیر آدمیوں کے ساتھ اس طرح بے باکانہ ملتے ہوئے دیکھ کر نصیر کے اندر حسد کی آگ سلگ پڑتی۔ "وہ ایسا کیوں کرتی ہے" وہ اپنے دل میں کہتا "وہ تو میری بیوی ہے"۔ پھر خود بخود اسکے لبوں پر ایک پھیکی سی ہنسی نمودار ہو جاتی جس کی تہ میں نہ جانے حسرت و پشیمانی کے کتنے آنسو ہوتے۔

"میری بیوی! میں تو اسے چھوڑ آیا۔ اب میرا اس پر کوئی حق نہیں۔ وہ جو چاہے کر سکتی ہے"

Taj Tahir Foundation

زاہدہ ہر ایک آدمی سے ہنس کر ملتی۔ لیکن جونہی نصیر کی شکل دیکھتی، اس کے ماتھے پر تیوریوں کا جال بُنا جاتا۔ اس سے نصیر کو بے حد تکلیف ہوتی۔ لیکن وہ تسلی دینے کے لئے اپنے دل کو سمجھاتا "یہ وہ زاہدہ نہیں کوئی اور ہو گی" مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ زاہدہ کے لگائے ہوئے چرکے گہرے گھاؤ بن جاتے۔ جب وہ رات کو چارپائی پر لیٹے لیٹے اس کے متعلق سوچتا۔

عورت نرم دل ہونے کی وجہ سے بہت جلد معاف کر دیتی ہے لیکن اگر وہ معاف نہ کرے تو اس کا انتقام بہت شدید ہوتا ہے۔ اس کا احساس اب نصیر کو ہو چلا تھا۔ وہ شیلا سے جو اسے بھگا کر لائی تھی۔ سخت نفرت کرنے لگا۔ اس نے کلبوں اور ہوٹلوں میں جانا بھی بند کر دیا۔ ہاں! ایک چیز سے اس کا لگاؤ بہت بڑھ گیا ـــــ وہ تھی شراب ـــــ اتنی پیتا کہ پل بھر بھی ہوش نہ آئے۔ شاید وہ دل کے زخموں کو اس سے دھونا چاہتا تھا۔ مگر کہاں؟ وہ تو ناسور بن چکے تھے، ان کا علاج تو صرف زاہدہ ہی کے پاس تھا۔ پاکدامن بیوی کی معصوم محبّت اور بے لوث خدمت ہی انہیں ٹھیک کر سکتی تھی۔

رات کا پھٹ پٹا ہو رہا تھا۔ وہ گرتا پڑتا گھر سے نکلا۔ اپنی زاہدہ کی تلاش میں۔ اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو تسکین دینے کے لئے۔ وہ سڑکوں پر دیوانہ وار چلا جا رہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ سے بے خبر ـــــ

Taj Tahir Foundation

کسی بھی رستے پر۔ شائید وہ سمجھتا تھا۔ ہر راستہ اس کی زاہدہ کے ہاں جاتا ہے۔

رات کا ایک بجا تھا۔ سردی پورے شباب پر تھی۔ نصیر پر فالج گرا۔ دونوں ٹانگیں شل ہو گئیں۔ مردے کی طرح سڑک پر آ رہا۔ بالکل بے حس و حرکت! ادھر سے ایک کار گزری۔ اس میں زاہدہ بیٹھی تھی۔ وہ آخری شو دیکھنے کے بعد گھر لوٹ رہی تھی۔ ایک آدمی کو اس بری طرح سڑک پہ گرا دیکھ کر کار کو ٹھہرایا۔ اس کے پاس جا کر دیکھا۔

ایک دم اس کے منہ سے نکلا "سرتاج! یہ کیا ہو گیا آپ کو؟"

شوفر کی مدد سے کار میں لٹا کر نصیر کو اپنے گھر لے گئی۔ گھر پہنچتے ہی ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے کہا "مریض کی حالت خطرناک ہے۔ اسے آرام کی بے حد ضرورت ہے۔ ایک ایسا شخص ہونا چاہیئے، جو دن رات اس کے پاس بیٹھا رہے۔"

"میں حاضر ہوں ڈاکٹر صاحب" زاہدہ نے کہا۔

"آپ"! ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں نہیں، یہ تو میرا فرض ہے۔ میں اپنے فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کروں گی۔"

تقریباً دو راتیں اور دو دن گزر گئے۔ زاہدہ نے ایک پل آنکھ نہ جھپکی۔

تیسری رات اس نے پرانا لباس اتار کر وہ لباس پہن لیا جو نصیر کو بے حد پسند تھا۔ بالوں کو اسی طرح سنوارا جنہیں دیکھ کر کبھی نصیر کہا کرتا تھا "تو بالکل رانی دکھائی دیتی ہے زاہدہ! شاید اُسے احساس ہو چکا تھا کہ نصیر آج ہوش میں آجائے گا۔ نصیر کی بے ہوشی ختم ہو گئی۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی اپنی زاہدہ کو دیکھا۔

نصیر: "مجھے معاف کر دینا زاہدہ"

زاہدہ: "میرے سرتاج"! اور اس نے اپنا سر آرام سے نصیر کی چھاتی پر رکھ دیا۔

Taj Tahir Foundation

تیاگ

جب میں لاری سے اترا تو شام ہو چکی تھی۔ کوّوں کی ڈاریں تھکی ہاری اپنے گھونسلوں کی طرف جا رہی تھیں، دور شیشم کے بلند درختوں کے اوپر مغرب میں شفق کی لالی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف جھیل کے صاف شفاف پانی میں اس کا عکس پوری طرح ضو فگن تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کسی نے سیندور کی بے شمار بوریاں پانی میں انڈیل دی ہوں۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی ہرے بھرے کھیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا جاتا تھا۔ شام کے جھٹ پٹے میں رنگوں کا یہ امتزاج دیکھ کر یوں گمان ہوتا تھا۔ جیسے کسی چابکدست مصوّر نے سرمئی کاغذ پر ایک شاندار تصویر بنا دی ہو۔

دل میں سوچ رہا تھا کہ آج رات کہاں کٹے گی۔ گاؤں وہاں سے دس کوس کے فاصلہ پر واقع تھا اور میں دن بھر کے سفر سے تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اب اتنا

فاصلہ اور طے کرنے کی مجھ میں سکت نہ تھی، پھر وہ راستہ بھی تو غیر محفوظ تھا۔ سن رکھا تھا۔ گیدڑوں کے غول کے غول اپنے شکار کی تلاش میں رات کو اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں جونہی اکیلے دکیلے آدمی کو دیکھتے ہیں۔ اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ اس لئے یہی مناسب سمجھا کہ رات سامنے والے کھنڈر میں رہوں۔ صبح ہوتے ہی منزل مقصود کی طرف چل پڑوں گا میرا خیال تھا اس ویرانے میں کوئی نہ ہوگا۔ گلی سڑی دیواریں، کلر سے ڈھکی ہوئی زمین، صحن کے وسط میں ببول کا ایک سوکھا ہوا درخت کہیں کہیں پرندوں کے بکھرے ہوئے پر، یہ تمام چیزیں میرے دماغ پر ایک عجیب قسم کا ہولناک اثر ڈال رہی تھیں۔ میں اس میں داخل ہوا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ اس اجڑی ہوئی عمارت میں گھاس پھونس کی بنی ہوئی ایک جھونپڑی ہے اور اس میں ایک آدمی بھی رہتا ہے۔ میں ڈرتے ڈرتے جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اور آہستہ سے آداب عرض کیا۔ وہ آدمی میرے سلام کا جواب دینے کی بجائے میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لینے لگا۔ پھر جیسے اس کی حالت متغیر ہوگئی۔ اور اس نے بڑی نرمی سے مجھے اپنی چٹائی پر بیٹھ جانے کو کہا۔

"میں صرف رات بسر کرنا چاہتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ خوشی سے رہو بیٹا! یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ اور میں آرام سے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اب میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا میں نے اندازہ کیا کہ اس کی عمر کوئی چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی لیکن اس کا تمام چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بڑھے ہوئے بال

Taj Tahir Foundation

سوکھی ہوئی گھاس کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ جب اس نے مجھے اپنی طرف یوں ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آئی اور پھر کہنے لگا۔

"کیا دیکھتے ہو بیٹا! سوچ رہے ہو گے کہ یہ بوڑھا کتنا وحشت پسند ہے۔ بستی چھوڑ اجاڑ میں آ ڈیرا جمایا ہے۔ تم پہلے کھانا کھالو۔ اس کے بعد میں تمہیں اپنے متعلق سب کچھ بتاؤں گا۔"

پھر اس نے دیئے میں تیل ڈالا اور اسے روشن کر دیا۔ باہر کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ چاند تو اس رات نہیں نکلا تھا۔ البتہ دودھ میں دھوئے ننھے ننھے تارے کھرے آسمان پر نہایت خوبصورت طریقہ سے ٹمٹما رہے تھے۔ میں فطرت کی کاریگری کے ان لامحدود نمونوں کو دیکھنے میں محو تھا کہ میرے میزبان نے مجھے چونکا دیا۔

"کھانا تیار ہو چکا ہے بیٹا!"

"بہت اچھا بابا جی!" کہتے ہوئے میں کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ جب سیر ہو چکا تو یونہی اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ چراغ کی مدھم روشنی میں میں نے اپنے میزبان کو پھر ایک بار غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے کی ہر جھری کسی سربستہ راز کی کنجی معلوم ہوتی تھی۔ ایکدم مجھے خیال آیا کہ اس نے اپنی زندگی کے حالات سنانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں پھر چٹائی پر بیٹھ گیا اور اس سے آپ بیتی سنانے کے لئے اصرار کرنے لگا۔

"ہاں سناتا ہوں۔" اس نے کہا۔

اور اس کی نگاہیں جھونپڑی کے دروازے سے نکل کر دور زمین کی وسعتوں میں کھو گئیں

Taj Tahir Foundation

جیسے ماضی کے دھندلکے میں اپنے گزشتہ واقعات ڈھونڈ رہی ہوں پھر اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور اپنی سرگزشت یوں سنانا شروع کی۔

"آج سے بیس برس پہلے کا ذکر ہے جب میں جوان تھا۔ دل میں نت نئے نئے ولولے پیدا ہوتے، نئی نئی امنگیں اٹھتیں۔ میرا باپ گاؤں کا چودھری تھا۔ اس لئے ہر کوئی میری عزت کرتا میں بھی ان کی قدر کرتا اور ان کے دکھ سکھ میں بڑے شوق سے شریک ہوتا! ایک دن صبح کے وقت میں اپنی حویلی کے برآمدے میں بیٹھا کھیتوں کی ہریاول کا نظارہ کر رہا تھا کہ ادھر سے نارائن گزرا۔ یہ گاؤں کا بڑا زندہ دل آدمی تھا۔ اس نے مجھے پرنام کیا۔ میں نے نہایت بخندہ پیشانی سے اس کا جواب دیا۔

"کہو کیا حال ہے نارائن" میں نے کہا۔

"اچھا ہوں چھوٹے چودھری" اس نے نہایت مریل سی آواز میں کہا۔

میں "کہو بات کیا ہے کچھ بجھے بجھے سے نظر آتے ہو؟"

نارائن :- کیا بتاؤں۔ رات چوروں نے مار مار کر وہ درگت بنائی کہ زخموں کی وجہ سے سارا جسم نڈھال ہو رہا ہے"

"یہ دیکھو" اس نے آگے بڑھ کر مجھے اپنا سر دکھاتے ہوئے کہا "کتنا گہرا زخم ہے"

"یہ تو خیر ہوئی کہ تین چار بھلے مانس اس جگہ آ گئے۔ ورنہ میرے مرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی"

میں :- بڑا افسوس ہے نارائن مجھے"

نارائن :- ہاں چودھری یہاں تک جو ہونا تھا سو ہوا۔ مجھے تو اب یہ ڈر ہے کہیں میرے

Taj Tahir Foundation

بیلوں کی جوڑی مجھ سے نہ چھن جائے کیونکہ وہ بدمعاش تین چار دفعہ پہلے بھی اس کی کوشش کرچکے ہیں

میں :۔ یہ بات ہے (کچھ دیر سوچ کر) کیا خیال ہے اگر کچھ دنوں کے لئے تیرے بیلوں کی رکھوالی میں کیا کروں ؟"

نارائن :۔ "تم کیا کروگے بیلوں کی رکھوالی ؟" (حیرت سے)

میں :۔ ہاں، دیکھتا ہوں، کس کی ہمت پڑتی ہے انہیں ہاتھ لگانے کی!

طبیعت اتنی نڈر واقع ہوئی تھی کہ بڑے سے بڑے خطرے کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ نارائن نے لاکھ سمجھایا کہ اس ارادے سے باز آجاؤ لیکن میرے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ شام ہوتے ہی کھانا کھایا اور لٹھ اٹھا کر نارائن کے کھیتوں میں جا پہنچا۔ وہ بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور چارپائی پر بستر بچھا دیا۔ کچھ دیر ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر نارائن کو نیند آنے لگی اور وہ اپنی کٹیا میں جا کر لیٹ رہا لیکن مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ کھیتوں کی نالیوں میں پانی کے بہنے کی آواز دماغ کو نہایت سکون اور فرحت بخش رہی تھی۔ ہوا کے لطیف جھونکے نہ جانے آ آ کر کیا کہتے تھے۔ شاید انہیں بھی جوانی کی بے پناہ لذتوں کا احساس تھا۔ میں ایک اضطراری کیفیت میں چارپائی پر لیٹ گیا دل عجیب قسم کی بے چینی محسوس کر رہا تھا لیکن اس بے چینی میں بھی کتنی مسرتیں پنہاں تھیں۔ جگمگاتے ہوئے سندر تاروں کی چمک دمک دیکھ کر یوں گمان ہوتا تھا جیسے فلک کے شامیانے پر انہیں نیا نیا ٹانکا گیا تھا۔ ان کی بے ربط قطاریں کائنات کے حسن میں کتنا ربط اور سلیقہ پیدا کر رہی تھیں۔ دنیا اتنی بڑی ہونے کے باوجود ایک خوشنما کھلونا معلوم

ہوتی تھی۔ ان مظاہر قدرت کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھ لگ گئی۔ میں ابھی پوری طرح سو نہیں پایا تھا کہ مجھے پانی میں کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کنوئیں کی طرف لپکا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کنوئیں کے نزدیک ایک لڑکی حیران و ششدر کھڑی پریشانی میں اپنے دونوں ہاتھ مل رہی ہے مجھے دیکھتے ہی وہ جیسے سہم سی گئی۔ میں کچھ دیر اس حسن کے مجسمے کو دیکھتا رہا۔ اف کتنی جاذبیت تھی اس کی اداؤں میں! گھبراہٹ کی وجہ سے اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی تھی۔ اس کی چھاتی کا اتار چڑھاؤ جیسے سروں کے زیر و بم کی طرح میرے انگ انگ میں کپکپی پیدا کر رہا تھا۔ اس نے ایک پل کے لئے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر مڑ کر جانے لگی۔

میں:۔ ٹھہرو! کھیتوں کی رانی کہاں جاتی ہو؟"

وہ:۔ گھر جا رہی ہوں، دوسرا گھڑا لانے، باپو بیمار ہیں، رادھا شام کو پانی لانا بھول گئی انہیں اس وقت پیاس لگی تو میں پانی لینے چلی آئی۔ ہمارا گھر کچھ زیادہ دور نہیں ہے . . . . . . منڈیر پر گھڑا رکھ کر اس میں پانی ڈالنے لگی تو وہ اچانک کنوئیں میں جا گرا۔"

میں:۔ "ٹھہرو! واپس کیوں جاتی ہو، میں لائے دیتا ہوں، تمہیں دوسرا گھڑا۔"

میں بھاگتا ہوا گیا اور کٹیا سے نارائن کا گھڑا اٹھا لایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے گھڑا مجھ سے لے لیا اور کنوئیں سے پانی نکالنے لگی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھا غور سے اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ پانی نکالنے کے لئے چرخی گھماتی تو اس کے کندھوں میں کس تناسب سے جنبش پیدا ہوتی اور اس کے گداز جسم میں اس طرح سلوٹیں پڑتیں جیسے ہوا کے

کے جھونکوں سے ریشمی پھریرے ہیں لہریں۔ پانی بھر چکی تو مجھے گھڑا اٹھوانے کے لئے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے گھڑا اٹھواتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"آشا" پھر وہ چل دی لیکن تین چار قدم چل کر پھر لوٹ آئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں تمہارا نام پوچھنا تو بھول ہی گئی۔"

"میرا نام ——— دلیپ"

"اچھا تو میں چلتی ہوں۔ تمہارا گھڑا کل تمہیں واپس دے جاؤں گی۔"

یہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی۔ دوسرے دن وہ گھڑا لوٹانے کے لئے آئی اور ہم دونوں اس طرح ملے جیسے مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس کے بعد ہم ہر روز کسی نئے کسی طریقہ سے ملتے۔ کبھی پیپل کے گھنے سائے کے نیچے، اور کبھی تاروں کی چھاؤں میں کھیتوں کے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں ہمیشہ ہمارے لئے چشم براہ رہتیں اور ہم آزاد ہرنوں کی طرح دنیا کے رنج وغم سے بے خبران پر اٹھلاتے پھرتے۔

اسی طرح مہینوں پہ مہینے گزرتے گئے، اور ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اتنے ضروری بن گئے، جتنے زندگی کے لئے پانی اور ہوا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔

"آشا! ہم دونوں لگن کیوں نہ کر لیں؟"

اس کے چہرے پر حیا کی ایک لہر دوڑ گئی، وہ اٹھی اور جواب دیئے بغیر بھاگ گئی۔

Taj Tahir Foundation

لیکن جواب کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا رواں رواں "ہاں" کہہ رہا تھا۔ شاید اُسے اپنی منزل یاد آگئی، جو یوں بے اختیار اس کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کے بعد میں نے اُسے جب کبھی دیکھا اس میں ایک خاص قسم کی تبدیلی محسوس کی جھکی جھکی سی نگاہیں، چہرے پر شرم کی لالی، اداؤں میں شوخی سے زیادہ جھجک، نہ جانے میں نے کون سے تار کو چھیڑ دیا تھا جس سے ساز خود ہی سرمست ہو گیا تھا، میری زندگی اب خالی خالی اور اداس رہنے لگی۔ میں نے یہ عہد کر لیا کہ یہ بات پتاجی کے کانوں تک پہنچا کر ہی رہوں گا۔ اس کا طریقہ میں نے یہ سوچا کہ نارائن کو سب کچھ بتا دوں، وہ ضرور اس کام میں میری مدد کرے گا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، نارائن کو سب کتھا سنا دی،

وہ کہنے لگا،

"اتنی سی بات تھی، میں آج ہی جاؤں گا چودھری کے پاس، ایشور کی کرپا سے سب کام ٹھیک ہو جاتے گا!"

اور وہ سچ مچ شام کو ہمارے گھر پر آدھمکا،

نارائن: "نمسکار ہے بڑے چودھری"

پتاجی: "آؤ، آؤ نارائن کیسے آنا ہوا"

نارائن: "یونہی جی میں آئی کہ چودھری کے درشن کر آؤں"

پتاجی :۔ ہاں ، ہاں بیٹھو

نارائن :۔ کیوں چودھری ! آپ نے دلیپ کا گھر بسانے کی فکر بھی کی ہے یا نہیں ؟

پتاجی :۔ ہاں نارائن ! فکر تو ہے لیکن بر تلاش کرنا بڑا کٹھن کام ہے ، تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہو تو بتاؤ ۔

نارائن :۔ "ہے تو سہی"

پتاجی :۔ "کیا نام ہے اس کا ؟"

نارائن :۔ "آشا"

پتاجی :۔ "تمہاری مراد سری ہرنام داس جی کی بیٹی سے ہے ـــــــ بھئی بر تو اچھا ہے ۔

نارائن :۔ "تو پھر دیر کا ہے کی "

پتاجی :۔ "ٹھیک کہتے ہو نارائن ، میں کل ہی ان کے ہاں جاؤں گا"

اس دوران میں میرے پتا نے کچھ خرید و فروخت کے لئے مجھے شہر بھیج دیا ۔ سال میں دو تین دفعہ میں پہلے بھی شہر جایا کرتا تھا ، یہاں میرے ایک رشتہ دار رہتے تھے ، میں اکثر ان کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا ، اس دفعہ بھی میں نے انہی کے ہاں قیام کیا ، خرید و فروخت سے جلد فراغت پانے کے بعد میں نے ان سے اجازت لینا چاہی ، لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ میں

Taj Tahir Foundation

کچھ دنوں کے لئے اور انہیں کے پاس رہوں، میں مان گیا، دسویں بارھویں دن جب میں شہر سے روانہ ہونے ہی کو تھا کہ پتاجی کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ جلد آؤ تمہاری شادی طے پا گئی ہے، مجھے سخت حیرت ہوئی، کہ اتنے سے عرصے میں یہ سب کچھ کیونکر ہوگیا، جلدی جلدی گاؤں پہنچا تو معلوم ہوا، کہ برات کی سب تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، اور اب فقط دولہا کی انتظار ہو رہی ہے، شرم کے مارے میں پتاجی سے تو کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن نارائن کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ میری شادی عین میری منشا، کے مطابق ہو رہی ہے، تو مجھے اطمینان ہوا اور میں خوشی خوشی شادی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگا،

سہاگ کی پہلی رات تھی، میں جذبات کے تیز دھارے کو اپنے دل میں سنبھالے دلہن کے کمرے میں داخل ہوا، اور کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہنے کے بعد میں نے اس کا گھونگھٹ سرکایا، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی، کہ یہ آشا نہیں تھی، ایک دم میرے دل پہ بجلی سی گری، تمام ارمان جل کر خاکستر ہو گئے، کیسے کیسے سپنوں سے اپنے دل کو بہلایا کرتا تھا، لیکن سب دھرے کے دھرے رہ گئے، میں بڑی تیزی سے کمرے سے باہر نکلا، اور چوٹ کھائے ہوئے دل کو لئے کنوئیں کی طرف چل پڑا ـــــــ اسی کنوئیں کی طرف جہاں میں پہلی دفعہ آشا سے ملا تھا ـــــــ جہاں میرے دل نے پہلی دفعہ محبت کا راگ الاپا تھا، اور میں نے اور آشا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں قسم کھائی تھی کہ عمر بھر ایک دوسرے کا ساتھ

Taj Tahir Foundation

نہ چھوڑیں گے، کنوئیں پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں، آشا ایک درخت کا سہارا لئے نہایت مغموم انداز میں چاند کی طرف دیکھ رہی ہے، میری آہٹ سنتے ہی چونک پڑی، اور سمٹ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی، کچھ دیر ہم دونوں بے بسی کے عالم میں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، گویا زبانِ خاموشی سے دنیا کے کٹھور پن کو کوس رہے تھے، پھر وہ بولی،

"دلیپ میں جانتی تھی کہ تم یہاں ضرور آؤ گے اسی لئے میں رات ہوتے ہی یہاں چلی آئی ہیں تمہیں اپنے داغ دکھانے نہیں آئی دلیپ! بلکہ یہ بتانے آئی ہوں کہ جیسے بھی ہو تم مجھے بھول جانے کی کوشش کرنا، کیونکہ اسی میں تمہارا بھلا ہے، رادھا میری بہن ہے نہایت وفادار اور سلیقہ مند لڑکی ہے، وہ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیگی"

میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگوں میں لرزہ پیدا ہو رہا ہے اور وہ کھڑی ہونے سے عاجز ہے،

"کیا ہو رہا ہے آشا تمہیں؟" میں نے اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے زہر کھا لی ہے دلیپ"

"زہر!" بھرائی ہوئی آواز میں میرے منہ سے نکلا،

"ہاں زہر —— کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی، تمہارے آنے سے تین چار منٹ پہلے ہی میں نے اسے نگلا ہے"

"ایسا کیوں کیا آشا تم نے ؟"

"اس کے سوا میرے لئے اور کیا چارہ تھا ـــــ یہ لو کاغذ کا ایک ٹکڑا ۔ اس پر میں نے تمہارا بے قصور ہونا لکھ دیا ہے " وہ بولی ۔

اب اس کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں ، میں نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا اور اس نے وہیں میری طرف دیکھتے ہوئے جان دے دی ، میں اس کی لاش اٹھا کر گھر لے آیا ، لوگوں کو علم ہوا تو سارے گاؤں میں ایک کہرام مچ گیا ، ہر کوئی میری ہی طرف دیکھتا تھا ، جیسے میں ہی اس کی موت کا کارن تھا ، تھوڑی دیر میں سری ہرنام داس بھی آ گئے ، اور لڑکی کی نعش کو دیکھتے ہی اپنا ماتھا پیٹنے لگے ، کریا کرم سے فراغت ہوئی تو پتا جی میری طرف متوجہ ہوئے ، میں نے انہیں شروع سے لے کر اخیر تک سب ماجرا کہہ سنایا ۔ پھر وہ روتے ہوئے بولے ،

" نادان ! تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتایا ؟ میں جب سری ہرنام داس کے ہاں رشتہ لینے گیا تھا تو میں نے آشا ہی کو تمہارے لئے مانگا تھا ۔ لیکن انہوں نے اس کے لئے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ بڑی بہن کے ہوتے ہوئے میں آشا کی شادی کیسے کر سکتا ہوں اس لئے میں نے رادھا ہی کو تمہارے لئے منظور کر لیا ۔ اگر مجھے تمہاری اور آشا کی محبت کا علم ہوتا تو میں ہرگز ایسا نہ کرتا "

اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے میرے دل پر اس واقعہ کا اثر اور بھی زیادہ ہوتا گیا، مَیں ہر وقت گُم سُم نارائن کے کنوئیں پر بیٹھا رہتا، سب مجھے سمجھاتے بجھاتے، لیکن مجھے تسکین نہیں ہوتی تھی، شروع شروع میں مَیں رات کو گھر آ جایا کرتا تھا لیکن اب میں نے رات کو گھر جانا بھی ترک کر دیا، پتاجی میری حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتے تھے، لیکن ان کے پاس بھی میرے درد کا درماں نہ تھا، آخر وہ بھی میرے غم میں گُھل گُھل کر راہی ملکِ عدم ہو گئے۔

اب میرے لئے دنیا اندھیر ہو گئی، دیوانہ وار گاؤں کی گلیوں میں چکّر کاٹتا رہتا، اگر کسی کو ترس آ جاتا تو گھر پہنچا جاتے، ورنہ یونہی در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا، ہری ہرنام داس جی نے پہلے تو بہت کوشش کی کہ مجھے میرا غم بھلا سکیں، لیکن وہ بھی ناکامی کا منہ دیکھ کر چپ ہو رہے اور رادھا کو اپنے گھر لے گئے۔

میرا دل گاؤں سے بالکل اُکتا گیا تھا، اب کون تھا جو مجھے وہاں رہنے کے لئے مجبور کرتا، یہی جی میں آئی کہ گاؤں چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں، چنانچہ ایک دن نیم مجنونانہ حالت میں گاؤں سے نکل بھاگا۔

سردیوں کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات تھی، ہوا کے تند جھونکے میرے جسم کو تیروں کی طرح چھید رہے تھے، تین دن کا بھوکا پیاسا کسی مکان کی دہلیز پر سر رکھ کر سو گیا۔ جب

آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں ...... بہت سے سادھو میرے ارد گرد کھڑے ہیں۔
اور حیرت سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

دراصل یہ ایک آشرم تھا اس میں رہنے والا ایک سادھو اس رات ادھر سے گزرا مجھے اس طرح پڑا ہوا دیکھ کر یہاں اٹھا لایا، میں تین چار روز تک ان کے پاس رہا، مجھے یہ فضا راس آگئی، اور میں نے ان کے گورو سے اجازت لے کر وہیں رہنا شروع کر دیا۔ بھگوان کی یاد اور نیک لوگوں کی صحبت سے میرے دل کو ایک گونہ تسکین ہونے لگی۔ اور میں اپنی زندگی کو انہیں کے طور طریقوں کے مطابق گزارنے لگا، تین چار سال تک میں انہیں کے پاس رہا۔ اس کے بعد میری طبیعت اور زیادہ تنہائی کی جویا ہوئی، اور میں نے ان سے اجازت لے کر یہاں ایک علیحدہ جھونپڑی بنالی، تیرہ سال ہو گئے مجھے یہاں رہتے ہوئے —— ارد گرد کے تمام لوگ مجھے پہنچا ہوا آدمی سمجھتے ہیں۔ لیکن پگلوں کو یہ علم نہیں کہ یہ بوڑھا زندگی کی شاہراہ کا محض ایک تھکا ہارا مسافر ہے جو فقط اپنی موت کی راہ دیکھ رہا ہے ——

"رات کافی گزر چکی ہے، بیٹا اب سو جاؤ، صبح ہوتے ہی تمہیں جانا ہوگا۔"

اور میں ان واقعات کو اپنے دماغ میں دہراتے ہوئے گہری نیند سو گیا۔

Taj Tahir Foundation

اندھی لکیریں

Taj Tahir Foundation

دیرا کے پیٹ میں یکایک اِس زور کا درد اٹھا، کہ چارپائی تک نہ بچا سکی۔ اور نڈھال ہوکر جہاں تھی وہیں فرش پر لیٹ گئی،

دینا دھوبی اپنی لاڈلی بچی کی یہ حالت دیکھ کر سہم سا گیا، دیرا ہی تو اس کا کُل اثاثہ تھا، پورے سترہ برس سے وہ اِس نرم و نازک ڈالی کی پرورش کر رہا تھا؛ دیرا ابھی پانچ سال کی ہوگی کہ دینا کی گھر والی چل بسی، اس وقت اگر وہ چاہتا تو آسانی سے دوسری شادی کر سکتا تھا، لیکن اُس نے اپنی بچی کی بھلائی اِسی میں دیکھی کہ باقی ماندہ عمر شادی کے بغیر ہی گزار دے، دیرا اس کے چھوٹے سے گھر کا اُجالا تھی؛ اسی کے دم سے دینا کی زندگی کا بازار گرم تھا، ورنہ اَب دُنیا میں اس کے لئے رکھا ہی کیا تھا،

وہ دوڑتا ہوا جیواں کے پاس گیا، جو گاؤں کی جہاں دیدہ بوڑھی تھی، اور امیر گھرانوں کے لئے بَر تلاش کرنا، اور ان کے رشتے ناطے کرانا اس کا سب سے بڑا مشغلہ تھا، لیکن غریبوں کے لئے بھی وہ کچھ کم فائدہ مند نہیں تھی، ایک دم وہ اسے طبیب، ثالث اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے تھے، نتّو ایتلی کی جورو اگر بگڑ کر ہر مہینے میکے چلی جائے تو صلح جیواں ہی کرائے، نتھو چمار اور اُس کے بیٹے میں اگر جوت پیزار ہو جائے، تو جیواں ہی بیچ میں پڑے اور معاملہ رفع دفع ہو، اور اگر خدا نخواستہ کسی بچے کو خسرہ نکل آئے تو علاج بھی جیواں ہی کرے، ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے، نلنی مٹوارن کو اس زور کا بخار چڑھا کہ پندرہ دن تک لوہے کی طرح تپتی رہی، آخر جیواں ہی آڑے آئی، تین پیسے کا ایسا نسخہ تیار کر کے دیا، کہ کھاتے ہی اُس کا بخار اُترنے لگا اور ہفتہ بھر میں تو نلنی بالکل نو بہ نو تھی، دینا کو دیکھ کر بولی،

"کاہے رے! اتنا پریشان کیوں دکھتا ہے!"

"موسی! میری بچّی کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔ ذرا چل کر دیکھ لو بے چاری مری جا رہی ہے"!

"اچھا اچھا چلے ہوں۔ پیٹ مَل دوں گی تو سب آرام آجائے گا!"

دینا کے گھر پہنچ کر اُس نے سرسوں کا تیل مانگا اور ویرا کو چارپائی پر لٹا دیا،

لیکن پیٹ کو چھوتے ہی اُس نے اپنا ہاتھ اس طرح پیچھے کھینچا۔ جیسے کسی بچھو نے ڈس لیا ہو

"کلجگ ہے کلجگ!" وہ بولی۔

"کیا ہوا موسی؟" دینا نے پوچھا۔

"ارے اِس نگوڑی کے پیٹ میں تو بچّہ ہے۔"

"بچّہ ——!" سخت حیرانی کے عالم میں دینا کے مُنہ سے نکلا۔

"ہاں ہاں بچہ" وہ چلّائی،

اور پھر دیپا کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"اری پاپن! کہاں سے کرایا ہے مُنہ کالا۔ رام، رام، رام! اتنی بے حیائی! سارے گاؤں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔"

اس نے جلدی سے اپنے سلیپر پہنے اور بڑبڑاتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔

دینا پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا ہو، وہ ایک طرف بالکل سکتہ کی سی حالت میں کھڑا تھا، اور آنے والی مصیبتیں خوفناک پرچھائیاں بن کر اس کے اِرد گرد ناچنے لگی تھیں سوچتا تھا وہ جدھر سے نکل جائے گا، لوگ اُس پر انگلیاں اٹھائیں گے کنواریاں اِس سے دامن بچا کر چلیں گی، اور برادری والے اُس سے اپنی تمام راہ و رسم ترک کر دیں گے۔

ادھر جیواں کی زبانی گاؤں کے ایک ایک آدمی کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی، کہ دینا کی کنواری بیٹی حاملہ ہے، شام ہوتے ہی گاؤں کے چار پانچ معزز آدمی جن میں سیٹھ دھنی رام کالڑکا مادھو بھی شامل تھا، دینا کے گھر آئے، اور دروازے پر دستک دی، دینا جو یاس کی تصویر بنا بیٹھا تھا، نہایت مردہ دلی سے اٹھا، اور دروازہ کھول دیا،

"کون ؟ مکھ جی ! آیئے آیئے مہاراج" ! اس نے نہایت لجاجت سے کہا

"نہیں دینا ہمیں اندر نہیں آنا، ہم تو صرف یہ کہنے آئے ہیں۔ کہ صبح پو پھٹنے سے پہلے پہلے تم گاؤں چھوڑ دو، ورنہ کل تمہارے گلے میں جوتیوں کا ہار پہنا کر زبردستی تمہیں گاؤں سے باہر نکال دیا جائے گا" نانک رام صرّاف بولا۔

"اور ہاں دینا ! کل کے بعد ہم تمہارا اور تمہاری کلموہی بیٹی کا منہ اس گاؤں میں پھر کبھی نہ دیکھیں" مادھو بولا۔

دینا خاموشی سے ان کی ملامتوں کے تیر برداشت کرتا رہا، سماج کی نظر میں وہ ایک مجرم تھا، اس کی بیٹی نے ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کیا تھا جس کی تلافی صرف موت ہی سے ہو سکتی تھی،

رات کافی گزر چکی تھی، لیکن دینا اسی طرح غم و افسردگی کی تصویر بنا دیوار سے

ٹیک لگائے بیٹھا تھا، طرح طرح کے خوفناک خیالات اس کے دماغ میں آتے تھے، گاؤں کے گجر نے دو بجائے، دینا ایک مہیب ارادے سے لرزتا ہوا، ویرا کے سرہانے جا کھڑا ہوا، مصیبت کے سمندر میں غوطہ لگانے کے باوجود وہ کس قدر سکون کے ساتھ محو خواب تھی، دینا نے ایک لحظہ کے لئے اسے دیکھا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اُس کے گلے کے پاس لے گیا، قریب تھا کہ اس کا سارا خون سمٹ کر اس کے دونوں بازوؤں میں آجائے کہ اُس کی توانائی جواب دے گئی، اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ویرا کی چارپائی سے دُور ہٹ گیا۔

اب وہ اس معاملہ کے کسی اور ہی پہلو کے متعلق سوچ رہا تھا، اور نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ کہ مندر سے گھنٹوں کی آواز سنائی دی، اس نے اپنی بیوی کے چھوڑے ہوئے زیورات اور پہننے کے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی اور پھر بڑی شفقت سے ویرا کو جگا دیا۔

دونوں باپ بیٹی گھر سے نکلے، اور اُس نالے کو عبور کر کے جہاں وہ اکثر کپڑے دھویا کرتے تھے، بڑی سڑک پر پہنچے۔ سامنے شنبھو کا ٹیلہ تھا، وہ دونوں اس پر چڑھ گئے، اور آخری بار اپنے گھر اور گاؤں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا، صبح کے دھندلکے میں دینا کو اپنا مکان سیٹھ دھنی رام کی عالی شان حویلی کے مقابلے میں یوں معلوم ہوا جیسے کوئی مفلس، کوڑھی کسی باجبروت شہنشاہ کے سامنے دم توڑ

رہا ہو۔ اور اس کی دکھیا آتما کو ان دونوں مکانوں کے درمیان ایک خونی لکیر کھنچی ہوئی نظر آئی۔

سکھ لال خیراتی ہسپتال کے ایک کمرے میں دینا دھوبی اور اس کی بیٹی ویرا دونوں بیٹھے ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے، آج سے چند ماہ قبل دینا بالکل چاق و چوبند اور تندرست نظر آتا تھا، بڑھاپے اور محنت کی کثرت کے باوجود اس کے چہرے پر ہر وقت بشاشت سی کھیلتی رہتی تھی لیکن اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے برسوں کی بیماری کے بعد بستر سے اٹھا ہی تھا،

ویرا بھی بہت نڈھال نظر آتی تھی، چہرے پر جیسے ہوائیاں اُڑ رہی ہوں وہ دیوار سے ٹیک لگائے پاؤں پسارے مضمحل سی نگاہوں سے کمرے کی چیزوں کو تک رہی تھی۔ کبھی کبھی دانتوں سے اپنے نچلے ہونٹ کو کاٹتی ـــــ جیسے جسم کے کسی حصہ میں منٹ منٹ کے بعد شدید درد کی ایک لہر دوڑ رہی ہو، کچھ وقت گزرنے کے بعد کمرے میں ڈاکٹر داخل ہوا۔

وہ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سے ویرا کو دیکھا ـــــ، پھر دینا سے مخاطب ہو کر بولا۔

Taj Tahir Foundation

"کہو کیا بات ہے ؟"

ویرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "حضور میری بیٹی کے ہاں بچہ ہونے والا ہے"

ڈاکٹر نے قدرے بلند آواز سے نرس کو پکارا ہے، ایک لحظہ میں نرس نمودار ہوئی ــــ

ڈاکٹر :- "کوئی بیڈ ــــــ خالی ہے کیا ؟"

نرس نے ایک آدھ منٹ کے لئے ویرا کی ملتجیانہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا

ـــــ" ہاں ڈاکٹر! آج صبح ہی ایک مریضہ کا بستر خالی ہوا ہے۔ بیچاری

کو بچے کی بڑی آرزو تھی، لیکن جب بچہ پیدا ہوا تو خود ہی چل بسی"

ویرا کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی، اور اس نے خوف زدہ نظروں

سے نرس کو دیکھا، ڈاکٹر جلدی جلدی ہسپتال میں داخلے کا فارم بھرنے لگا، اس نے

دینا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہارا نام ؟"

"دینا"

"گاؤں ؟"

"شورنگر"

"پیشہ ؟"

Taj Tahir Foundation

"حضور دھوبی ہوں۔"

"تمہاری بیٹی کا نام؟"

"ویرا ــــ" ڈاکٹر ویرا کی طرف دیکھتا ہے۔

اس کے خاوند کا . . . . . .

ٹیلی فون رنگ کرتا ہے۔

"امرناتھ . . . . . اچھا . . . . . ہوں ہوں۔ ٹھیک ہے، ابھی! اچھا ابھی آتا ہوں۔"

ریسیور کو رکھ دیتا ہے اور نرس سے ویرا کے رجسٹر کے باقی خانوں کو پُر کرنے کے لئے کہہ کر چلا جاتا ہے،

وہ رجسٹر کو دیکھتی ہے، اور پھر سے خانہ پُری شروع کر دیتی ہے، لیکن وہ بھی اس سوال کو پوچھنا بھول جاتی ہے، جو ٹیلی فون آجانے کی وجہ سے ڈاکٹر نہیں پوچھ سکا تھا، تمام خانوں کو پُر کر چکنے کے بعد وہ ویرا اور دینا کے انگوٹھوں کے نشان ثبت کرا لیتی ہے۔

ہسپتال میں داخل ہونے کے چند ہی گھنٹے بعد ویرا کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔

Taj Tahir Foundation

وہ بالکل تھکی تھکی اور کمزور نظر آتی تھی،

اُس کا چہرہ عظمت اور بزرگی کی تمام ایسی علامات سے عاری تھا، جو تخلیق کا اہم ترین فرض ادا کر چکنے کے بعد عورت کے چہرے پر خود بخود نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اس کی آنکھیں اس معبد کی طرح تھیں جس کے پجاریوں کی بے راہ روی نے اس کے سارے تقدس کو مٹی میں ملا دیا ہو، اور اب لوگ وہاں بھوت پریت کے ڈر سے جاتے ہوئے گھبراتے ہوں۔

رات گئے تک ڈیرا کو کئی انجکشن دیئے گئے۔ اور اب وہ بالکل سکون کے ساتھ سو رہی تھی، پاس ہی اُس کا بچہ پڑا تھا لیکن جب سے بچہ پیدا ہوا تھا۔ ڈینا بالکل گم سُم کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا تھا، اُس نے ایک دفعہ بھی آ کر ڈیرا کا حال نہیں پوچھا، اور نہ ہی بچے کو دیکھا، تھوڑی دیر کے بعد نرس آخری بار مریضوں کو دیکھنے کے لئے آئی، اور کمرے کی روشنی گل کر کے واپس چلی گئی، ڈینا ہسپتال کے پکے فرش پر اُس کی اونچی ایڑیوں والے جوتوں کی آواز دیر تک سنتا رہا ــــــــ!

آہستہ آہستہ ہسپتال کی دوسری بتیاں بھی بجھ گئیں، اور ساری فضا پر ایک سکوت سا چھا گیا، حتیٰ کہ باہر سڑک پر گھوڑوں کے سموں اور موٹروں کے ہارن کی آوازیں بھی خاموشی کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو گئیں،

Taj Tahir Foundation

لیکن دینا اسی طرح بیٹھا اپنے دل میں کسی بڑے ہی خوفناک ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے متعلق سوچتا رہا۔

صبح جب پو پھٹی تو نرس عام استعمال کی چھوٹی چھوٹی ادویات اور تھرمامیٹر ایک ٹرے میں رکھے ویرا کے کمرے میں داخل ہوئی، جونہی وہ ویرا کے بستر کے قریب پہنچی، اُس کے اوسان خطا ہوگئے، ویرا مری پڑی تھی، اس نے کھڑکیوں سے پردے کو ہٹاتے ہوئے ویرا کے چہرے کو غور سے دیکھا، وہ بالکل نیلا دکھائی دے رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے بڑی بے دردی سے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو، بچہ بھی غائب تھا، اور دینا بھی ـــــ سارے ہسپتال میں ایک کہرام بپا ہوگیا، مریضوں نے سہم کر اپنے چہرے چادروں میں چھپا لئے، ساری فضا پر ایک وحشت سی چھا گئی، ہسپتال کے مختلف حصوں میں نرسیں اکٹھی ہوکر چہ میگوئیاں کرنے لگیں، ایک گھنٹے کے لئے تو جیسے ہسپتال کا نظم و ضبط ہی ختم ہو کر رہ گیا، نہ کسی نے مریضوں کی دوا کا خیال کیا اور نہ ہی ان کی دیکھ بھال کی، تھوڑی دیر کے بعد ہسپتال کا سب سے بڑا ڈاکٹر آیا، اور آتے ہی نرس سے پے در پے سوال کر ڈالے،

"تم رات بھر یہیں رہیں؟ ـــــ" کیا تمہیں کسی قسم کا شور و غل سنائی نہ دیا؟"

"دینا کہاں تھا؟ اور وہ بچہ کیا ہوا؟"

اور جب وہ کانپتی ہوئی آواز سے کسی سوال کا جواب دینے لگی تو وہ بول اٹھا،

"تمہیں سونے کے لئے یہاں نہیں رکھا گیا، بلکہ اس لئے کہ مریضوں کا خیال رکھو، خود آرام کرنے کی بجائے انہیں آرام پہنچاؤ"

چلئے ڈاکٹر صاحب! اور وہ ہاؤس سرجن کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

شونگر کی گلیوں میں کوئی بوڑھا ایک مُردہ بچے کو سینے سے چمٹائے دیوانہ وار اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا، اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی، وہ جدھر سے گزرتا لوگ ڈر کے مارے ایک طرف ہو جاتے۔ اس کی داڑھی اور سر کے بڑھے ہوئے بالوں نے اس کے خدوخال کو بالکل چھپا رکھا تھا، کوئی بھی اُسے نہیں پہچانتا تھا، کہ یہ بوڑھا وہی بدنصیب دینا ہے جس کو چند ماہ پہلے گاؤں سے زبردستی نکال دیا گیا تھا، گاؤں کے گلی کوچوں میں چکر لگانے کے بعد جب وہ نانک رام صرّاف کی دکان کے سامنے آکر ٹھہرا۔ تو اس کی مسلسل چلتی ہوئی چھینی خود بخود رُک گئی۔ وہ اُس پگلے کا سر سے پاؤں تک جائزہ لینے لگا۔ جو ہر آنے جانے والے کو پھٹی پھٹی نظروں سے گھور رہا تھا، چند لمحوں کے بعد نانک رام کے ذہن پر ایک بجلی سی کوند گئی جب

Taj Tahir Foundation

اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ بدحال بوڑھا اس کے گاؤں کا دھوبی ہے۔ اس نے لوگوں کی مدد سے بچّے کی لاش کو اس سے چھین کر ٹھکانے لگایا۔ جب لوگ دینا سے مُردہ بچّے کو چھین رہے تھے، تو وہ اس طرح چیختا چلّاتا تھا، گویا اس کی تمام پونجی اس سے چھن رہی ہو، تاہم اس کی یہ اضطراری کیفیت تو غائب ہوگئی، لیکن اس واقعہ کے بعد اُس نے عادت بنالی، کہ جو شخص بھی اس کے قریب سے گزرتا، وہ اس کی طرف لپکتا، ایک لحظے کے لئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا، اور پھر چھوڑ دیتا، نہ جانے وہ کس کھوج میں تھا، اور کسے پانا چاہتا تھا،

وہ اکثر سیٹھ دھنی رام کی عالی شان حویلی کے سامنے برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھا رہتا، گاؤں والے ترس کھا کر بچا کھچا کھانا اسے دے جاتے، اگر کبھی جی چاہتا تو ایک دو نوالے کھا لیتا، ورنہ یونہی اس کے اردگرد پڑا سڑتا رہتا۔ اور بے شمار مکھیاں روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑوں اور باسی سالن پر بھنبھناتی رہتیں، لیکن اسے ان سے کوئی کوفت نہ ہوتی، اور اگر کسی راہ چلتے کی نظریں اس سے دوچار ہوجاتیں تو وہ گھبرا کر منہ دوسری طرف کر لیتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اندر لاوے کا ایک دریا بہہ رہا ہے، جو کسی دن پھوٹ کر ساری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، آدھی رات کے وقت کبھی کبھی وہ اس زور سے قہقہہ لگاتا، کہ آس پاس کی گلیوں میں سوئے ہوئے

کتے بھی بیدار ہو جاتے ، اور پھر آسمان کی طرف منہ کر کے یوں روتے ، گویا اس قہقہے کا مطلب خوب سمجھتے تھے ، نزدیک کے کوٹھوں سے معصوم بچے کچی نیند جاگ اٹھتے ، اور ڈر کے مارے اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹ جاتے ،

اسی طرح کئی ماہ گزر گئے ، سیٹھ دھنی رام کا بیٹا مادھو اپنے دوست سوشیل کے ہمراہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے بورڈنگ ہاؤس سے شور نگر کیطرف روانہ ہوا .

جون کی ایک گرم رات جب ہوا نے فضا کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا ، اور کائنات کی ہر چیز تصویر کی طرح ساکت تھی ، حبس کے مارے جانور اپنے ٹھکانوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئے تھے ، چاروں طرف ایک ہُو کا عالم تھا ، ہاں کبھی کبھی بستی سے دُور گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں ،

چاند بھی اس رات نہیں نکلا تھا ، اور ستارے سہمے ہوئے بچوں کی طرح اپنی پلکیں جھپک رہے تھے ، عین اس وقت دبنیا کے قریب سے دو راہی آپس میں باتیں کرتے ہوئے گزرے ،

ایک راہی :- آج تو جیسے دھرتی نے اپنا دم کھینچ لیا ہو ،

دوسرا راہی :- ہاں بھئی شور نگر میں ایسی گرمی کبھی نہیں پڑی ،

(اتنے میں گلی کے دو کتے بڑی دردناک آوازیں بھونکتے ہیں)

(دوسرا راہی بات کو جاری رکھتے ہوتے) جب بھی کتے اس طرح بھونکیں

کہتے ہیں ضرور کوئی آفت آتی ہے ،

پہلا : ہاں جانوروں کو آنے والے واقعات کا اکثر علم ہو جاتا ہے ،

حالانکہ انسان کو اپنی فراست کے باوجود ان کے متعلق کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

تھوڑی دیر کے بعد گھونگھروں کے بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے ، اور ساتھ ہی

ایک یکا نمودار ہوتا ہے ،

جب وہ برگد کے بوڑھے درخت کے قریب سے گزر کر سیٹھ دھنی رام کی

حویلی کے سامنے کھڑا ہونے لگتا ہے تو یکے کی مدھم سی روشنی میں مادھو کو درخت کے

نیچے ایک عجیب سی صورت دکھائی دیتی ہے ، بالکل کسی بھوت کی مانند ! وہ یکے

سے اتر کر سوشیل کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہتا ہے ،

" یار یہ بوڑھا بڑا خطرناک ہے ، میں نے تمہیں وہ واقعہ سنایا تھا نا ۔"

" کون سا واقعہ ؟ "

" وہی ویرا کے متعلق "

" ہاں تو پھر ؟ "

" یہ بوڑھا اس کا باپ ہے ۔"

"تو کیا ہوا۔ پگلا ہے۔ اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے"

اتنے میں دینا نے اس زور کا قہقہہ لگایا کہ پیڑ پر بیٹھے ہوئے تمام گدھ ایک بھاری پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ اڑے۔

مادھو اور سوشیل حویلی کے اندر چلے گئے۔ دیر تک مادھو کا دل خوف و ہراس کی وجہ سے دھک دھک کرتا رہا حتیٰ کہ کھانے کے بعد انہوں نے رمی کی دو تین بازیاں لگائیں۔ اور اپنی نگرانی میں حویلی کا دروازہ بند کروانے کے بعد صحن میں بچھے ہوئے بستروں پر دراز ہو گئے

سیٹھ دھنی رام لاکھ بُرا سہی۔ لیکن اس کی ایک عادت بہت اچھی تھی۔ وہ تڑکے ہی تڑکے بیدار ہوتا۔ ندی کی سیر کرتا ہوا شیوجی کے مندر میں پہنچتا اور وہاں پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر سورج نکلنے سے پہلے ہی واپس حویلی میں آجاتا۔ آج حسبِ معمول جب وہ اپنا بڑا سا گڑ سر پر رکھے ہاتھ میں چھڑی لئے حویلی سے باہر آنے کے لئے صحن میں سے گزرا تو ہکّا بکّا رہ گیا۔ اُس نے دیکھا۔ دینا مادھو کی چارپائی کے قریب فرش پر بیٹھا ہے۔ اس نے اپنے دونوں پھیلائے ہوئے ہاتھ اور دائیاں گال بڑے آرام سے مادھو کی چارپائی پر رکھے ہیں۔ اور

بالکل ساکت و جامد وہاں پڑا ہے۔ دمنی رام کے جسم میں ڈر کی وجہ سے ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اور وہ فوراً مادھو کی چارپائی کی طرف لپکا۔ اس نے زور سے دیتا کو ہلایا۔ لیکن وہ اسی طرح پڑا رہا۔ اُس نے مادھو کو جھنجھوڑا۔ لیکن وہ بھی بیدار نہ ہوا۔ اُس نے شور و غل سے حویلی کے تمام لوگوں کو جگا دیا۔ نوکر جاگ کر بھاگے ہوئے وہاں پہنچے۔ ایک نے جھک کر مادھو کو دیکھا اور خوف کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔

"سیٹھ جی! مادھو مر چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے اس کی رگوں کو مَسل دیا ہے۔"

بس پھر کیا تھا۔ ساری حویلی میں واویلا مچ گئی۔ سیٹھانی اپنی چھاتی کو پیٹتی ہوئی وہاں پہنچی۔ اور مادھو کی لاش کے ساتھ لپٹ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سوشیل جو اب پوری طرح جاگ چکا تھا۔ مادھو کے رات کے ڈر اور خوف کے متعلق سوچ رہا تھا۔ معاً اُس نے چوکیدار سے پوچھا۔

"کیوں بے مانو! حویلی کا دروازہ بند نہیں کیا تھا گیا؟"

"کیا تھا حضور! وہ تو اب بھی بند ہے۔"

"تو پھر یہ پگلا کیسے آیا یہاں؟" سوشیل بولا۔

"حضور حویلی کی پچھلی طرف سے ایک اور راستہ یہاں تک پہنچتا ہے۔"

ایک دوسرا نوکر بولا۔" لیکن سوائے خاص خاص آدمیوں کے اور کسی کو اس راستہ کا علم نہیں۔ البتہ دینا دھوبی کی لڑکی ویرا اس راستے سے ضرور واقف تھی۔ کیونکہ کبھی کبھی وہ چھوٹے سیٹھ کے کپڑے اِدھر سے دینے آیا کرتی تھی"۔

سوشیل پر حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی، اس نے ایک نظر دینا پر ڈالی جو اپنے مجرم کو سزا دینے کے بعد ابدی نیند سو رہا تھا۔ اور اُس کی نیم وا آنکھیں اپنی کامیابی پر تبسم کناں تھیں۔

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

سُراب

لاری فراٹے بھرتی ہوئی پہاڑوں کی پُرپیچ سڑک پر بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اور زمان اپنا سر گھٹنوں پر رکھے اس میں نہایت مغموم بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا: "میں کتنا کمزور ہو گیا ہوں۔ میرے بند بند میں نکاہت سما گئی ہے۔ ہر چیز پژمردہ اور پھیکی نظر آ رہی ہے۔ جیسے زندگی نے اپنا سب کچھ لٹا کر موت کی افسردگی خرید لی ہے۔ لاری ایک دم مڑی اور مسافر ایک دوسرے سے ٹکرا کر یکا یک نیم بے ہوشی کی حالت سے ہوش میں آ گئے زمان بھی خفیف سی جماہی لیتا ہوا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"اُف میں کتنا تھک گیا ہوں حالانکہ سفر نہایت آرام دہ تھا۔ مجھے وہ زمانہ ابھی تک یاد ہے جب میں ان جنگلوں اور وادیوں میں سارا سارا دن گھوما کرتا تھا لیکن تھکن

کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ دو قدم چلنے سے دم پھولنے لگتا ہے۔ میرا باپ قبیلے کے لوگوں سے کہا کرتا تھا ـــ "میرا بیٹا شیر ہے دیکھنا جب جوان ہو گا تو بڑے بڑے سورماؤں کو پچھاڑا کرے گا۔" اور پھر چمپئی بھی تو یہی کہا کرتی تھی زمان تم کتنے مضبوط ہو۔ اس سامنے والی چٹان سے بھی زیادہ جو زبردستی اپنا سینہ لوگوں کو دکھا رہی ہے۔"

آہ چمپئی! جو ایک کلی کی مانند تھی۔ جس کی ایک ایک ادا میں نسیم سحری کا سا سرور تھا۔ جس کی روشن پیشانی کو دیکھ کر صبح کا ستارہ بھی جھلملانے لگتا تھا۔ اب کھل کر پھول بن گئی ہو گی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی امنگیں ابھر کر شوریدہ سر آرزوئیں بن گئی ہوں گی لیکن میں جو بجھتی ہوئی شمع کی طرح ایک آخری ہچکی کا منتظر ہوں۔ اس کے سامنے کیسے جاؤں گا۔ اور اگر چلا بھی گیا تو کیا وہ مجھے پہچان سکے گی۔ ہرگز نہیں! اسے یقین بھی نہ آئے گا کہ یہ زندہ لاش اس کا زمان ہے۔ جسے ایک دن وہ فطرت کے تنومند مظاہر سے تشبیہہ دیا کرتی تھی۔

Taj Tahir Foundation

اس کی آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ پھرنے لگا جب وہ چمپئی کے پاس یہ خوشخبری لے کر گیا تھا کہ آکسفورڈ میں اس کے داخلے کا انتظام ہو گیا ہے اور عنقریب وہ وہاں چلا جائے گا۔ چمپئی کے کھلے ہوئے چہرے پر یہ سنتے ہی جیسے مُردنی کی ایک لہر

دوڑ گئی تھی۔ اور اس نے کتنی بے بسی کے عالم میں کہا تھا۔

"کیا کرنے جا رہے ہو وہاں؟"

"پڑھنے"

"کیا ابھی پڑھ پڑھ کر تمہارا جی نہیں بھرا؟"

"اری پگلی! ابھی تو پڑھنے کی تیاری کی ہے"

"ٹھیک — دس سال تو پڑھنے کی تیاری میں لگے ہیں اور اب پڑھائی میں کتنے سال لگیں گے؟"

"یہی کوئی پانچ چھ سال اور"

"پانچ چھ سال اور ——" اس نے لفظوں کو کسی روٹھے ہوئے بچے کی طرح کھینچتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر خاموش ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ آنے والی جدائی کی گھڑیاں اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر تیرنے لگی تھیں۔ زمان نے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کے شانوں کو پکڑا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔

"چمپی! کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہارا زمان ایک بڑا آدمی بن جائے"

تو اس نے مدھم سی مسکراہٹ کو اپنے چہرے پر لاتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے زمان! مگر ڈرتی ہوں کہیں شہر کی مسموم ہوا

Taj Tahir Foundation

تمہاری زندگی کو خطرے میں نہ ڈال دے۔ ناگنیں رہتی ہیں وہاں۔ جنہیں فقط خوبصورت چیزوں کو ڈسنے ہی میں لطف آتا ہے۔ اور پھر میرا زمان تو ان رنگین و پُربہار وادیوں کا منتخب ترین پھول ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں اس سے ہاتھ دھو بیٹھوں؟"

"تم تو خواہ مخواہ ڈرتی ہو چمپئی۔ تمہارے زمان کے پاس ایک ایسی مشعل ہے۔ جو اسے ہر جگہ راستہ دکھائے گی۔ اور اگر وہ ناگنیں اس کے قریب آئیں تو اس مشعل کی چکاچوند کر دینے والی روشنی ان کو اندھا کر دے گی۔ جانتی ہو وہ کونسی مشعل ہے؟"

"کون سی؟"

"میری چمپئی کی یاد! جو اس کے زمان کو ہر خطرے سے محفوظ رکھے گی"

"زمان!"

"ہاں! اور وہ اپنی پڑھائی کا زمانہ بغیر کسی دشواری کے گزار دے گا"

"کہیں ایسا نہ ہو میرا زمان انگلستان کی روپہلی فضا میں پہنچتے ہی اس سے اس قدر مسحور ہو جائے کہ ماضی کے سب نقوش ایک ایک کر کے اس کے دماغ سے غائب ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ چمپئی کی یاد بھی اس کے دل میں اپنے پاؤں نہ جما سکے۔"

زمان ماضی کی ان باتوں کو سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

"سچ کہتی تھی تو چمپئی"

Taj Tahir Foundation

انگلستان کی فضا میں پہنچتے ہی زمان کے دل میں چھپی کی بجائے تھی، روزنڈ اور فلورنڈا اسما گئی تھیں۔ انہوں نے راتوں کو آ کر اسے جگایا۔ رقص گاہوں میں گھسیٹا، شراب خانوں میں لے گئیں۔ اور ایک شرمیلے اور رسومات میں پلے بڑھے لڑکے کو چند ہی دنوں میں پورے درجے کا عیاش اور رنڈر بنا دیا۔ وہ کلب گھروں میں بے دھڑک جاتا لوگ اس کی بے پناہ جوانی اور مردانگی پر رشک کرتے، اس کے لمبے تڑنگے مضبوط جسم پر انگریزی لباس کی پھبن اور اس کے سُرخ و سپید چہرے کو دیکھ کر کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوتا کہ زمان اس ملک کا رہنے والا ہے جہاں کے لوگوں کو وہ "کالا آدمی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کے چوڑے چکلے اعضاء اور بڑی بڑی سُرخ آنکھیں وہاں کی لڑکیوں کے لئے ایک خاص کشش رکھتی تھیں۔ وہ جدھر سے گزر جاتا۔ لڑکیاں للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتیں۔ کچھ عرصے کے لئے زمان یہ سمجھا کہ وہ پریوں کے اکھاڑے میں آگیا ہے۔ یہاں اس کی حیثیت راجہ اندر سے کم نہیں لیکن یہ نہ سوچا کہ یہ سب اس کے روپ اور جوانی کی بھوکی ہیں۔ چند ہی دنوں میں جب طاقت و جوانی جواب دیدے گی تو یہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔

تین سال بمشکل گزرے تھے کہ زمان کی بے راہ روی نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا۔ انگلستان میں یہ اس کا آخری سال تھا۔ اور اسی سال اسے بی اے کا امتحان دینا تھا چنانچہ

Taj Tahir Foundation

امتحان تو اس نے دے دیا۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن کیا فائدہ؟ وہ اپنی متاعِ حیات کھو چکا تھا۔ اس کی تمام خوشیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مستقبل کا بھیانک چہرہ اسے ایک پل چین نہ لینے دیتا۔ سوچتا تھا گھر نہ جائے یہیں کہیں زندگی کے باقی ماندہ دن گزار دے۔ لیکن اسے اس ماحول سے وحشت ہو چلی تھی۔ کلب گھروں، ہوٹلوں اور رقص گاہوں کی چہل پہل اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ جب کبھی وہ کسی لڑکی کو قہقہے لگاتے ہوئے دیکھتا تو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھتا۔ ناگنیں! سچ کہتی تھی چمپئی۔ یہ مجھے ڈسنے میں کامیاب ہو گئیں۔ لیکن قصور سب میرا ہی ہے۔ میں نے وہ مشعل ہی کھو دی۔ جس کی چمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی۔ میں نے وہ چراغ ہی بجھا دیا جس کی روشنی مجھے راستہ دکھاتی —— چمپئی مجھے معاف کر دینا۔ تمہارا زمان ہمت کا نہایت ہی ہیٹا نکلا۔

اس نے یہی فیصلہ کیا کہ گاؤں چلا جائے۔ وہیں اسے تسکین ملے گی۔ یہی اس کے درد کا درماں ہے اور آج پورے تین سال کے بعد وہ اپنے گاؤں لوٹ رہا تھا۔

...... لاری بھاگتی چلی جا رہی تھی اور زمان سوچتے سوچتے بالکل سو گیا تھا۔ یکایک لاری ٹھہر گئی۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ محصول چوکی آ گئی تھی —— اور یہاں سے اس کا گھر بالکل نزدیک تھا۔ ہوا میں خنکی کافی بڑھ گئی تھی۔ دیالہ کے بڑے بڑے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اور شام کی

Taj Tahir Foundation

زرد دھوپ ہرے بھرے پہاڑوں کی چوٹیوں پر یوں معلوم ہوتی تھی۔ جیسے خوبصورت دلہنیں سونے کا تاج پہنے بنی ٹھنی بیٹھی ہوں۔ دور نیچے وادی میں چاندی کی طرح چمکتی ہوتی ندی سرسبز و شاداب وادی کی کڑھی ہوئی اوڑھنی پر گوٹا کناری کا کام کر رہی تھی۔

چند ہی منٹ میں اس کا وطن آ گیا۔ زمان نیچے اترا اور اپنا سامان اٹھوا کر گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ اطلاع دیئے بغیر گاؤں آ گیا تھا اس لئے کوئی بھی اس کا خیر مقدم کرنے نہ آیا۔ وہ کھیتوں کی پگ ڈنڈیوں پر ہولے ہولے ڈگ بھرتا ہوا جا رہا تھا کہ اسے آواز آئی۔

"اے سردار! میں تم سے محبت کرتی ہوں"

"جلدی آ جاؤ میری آنکھیں تمہارے دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ میں جانتی ہوں مرد بے وفا ہوتے ہیں لیکن پھر بھی تمہاری محبت میرا دل اپنی طرف کھینچتی ہے۔ خدارا اب تو آ جاؤ"

"دیکھو گلاب نے کسی شوخ دلہن کی طرح اپنا گھونگھٹ اٹھا دیا ہے اور بلبلیں دیوانہ وار فدا ہو رہی ہیں ——"

"بہار اپنے جوبن پر آ گئی ہے"

"خدارا اب تو آ جاؤ"

Taj Tahir Foundation

"چمپی! تم مجھے بلا رہی ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں اپنا چہرہ دکھاؤں لیکن میرا ارادہ متزلزل ہو رہا ہے۔ تمہاری آواز میرے گناہوں کے زخموں کو مندمل کر رہی ہے۔ ٹھہرو میں آ رہا ہوں"

اور اس کے قدم تیزی سے اس چشمہ کی طرف اٹھنے لگے۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کے خوشگوار ترین دن گزارے تھے۔ جہاں اُس نے چمپی سے عمر بھر جدا نہ ہونے کا عہد کیا تھا۔ جہاں کا ذرہ ذرہ ان کی پاک محبت سے تابناک ہو رہا تھا۔ جہاں کی فضا میں اب بھی ہزاروں اُمنگیں اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی تھیں۔

اس نے دیکھا چمپی چشمہ کے رستے ہوئے پانی پر ٹکٹکی لگائے کسی گہرے سوچ میں مستغرق ہے۔ شاید وہ اس کے انتظار میں قطرے قطرے کو گھڑیاں سمجھ کر شمار کر رہی تھی۔

زمان نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اس کے کندھے پر رکھا۔ وہ فوراً مڑی۔

"زمان!" اور اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ "آخر تم آ ہی گئے۔" اس نے جذبات کی شدت میں لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ بولی۔

زمان نے نرمی کے ساتھ اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کیا اور قریب ہی ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔

"ناراض ہو گیا مجھ سے؟" چمپی نے سہمی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا۔

لیکن وہ خاموش رہا۔

"بولتے کیوں نہیں زمان؟"

"بیٹھ جاؤ چمپی!" اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اور وہ اس کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔

"میری طرف دیکھو چمپی!"

"دیکھ تو رہی ہوں" اس نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا تم اس ہڈیوں کے ڈھانچے سے بھی محبّت کرتی ہو؟"

"ہاں! میں زمان کو چاہتی ہوں صرف اس کے گوشت پوست سے محبّت نہیں کرتی"

"سچ!"

اور زمان نے اسے اپنے پاؤں سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

بھینٹ!

باہر ہوا تیز چل رہی تھی۔ اس لئے شاعر نے پائیں باغ کی کھڑکی کو بند کر دیا۔ اس کی بیمار بیوی عذرا بالکل بے حس و حرکت چار پائی پر لیٹی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا خوب صورت سفید چہرہ بیماری کی وجہ سے زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھوں میں بھی وہ چمک نہ رہی تھی۔ لیکن اس کے لمبے لمبے سیاہ بال ابھی تک اُس کے شانوں پر پڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کا کوئی ہلکا سا جھونکا کمرے میں داخل ہوتا۔ اور عذرا کے چہرے پر اس کے بالوں کو بکھیرتا ہوا گزر جاتا۔ شاعر کچھ دیر تک نہایت غور سے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے اس کے قریب رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیوں آج اسے اپنی بیوی کے چہرے میں

Taj Tahir Foundation

اتنی جاذبیت نظر آ رہی تھی۔

"کیوں عذرا کیسی طبیعت ہے اب؟" اس نے بڑے شفقت آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"اچھی ہوں" عذرا نے بغیر کسی جنبش کے آہستہ سے کہا۔

شاعر نے بڑے پیار اس کے کملائے ہوئے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا "مجھ سے ناراض ہو گیا؟"

اس کے جواب میں عذرا کے رخساروں پر آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے ڈھلک آئے۔

چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ لیکن ہوا کی شائیں شائیں اس سکوت کو بڑے ہولناک طریقہ سے توڑ رہی تھی۔ جب کبھی بجلی چمکتی ہر طرف اُجالا پھیل جاتا۔ اور شاعر کو کھڑکیوں کے شیشوں میں سے دُور تک سفیدے کے درخت بے قرار روحوں کی طرح آپس میں سر ٹپکتے دکھائی دیتے۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اُس نے خود ہی بولنا شروع کیا۔

"میں جانتا ہوں عذرا تمہیں مجھ سے بہت دُکھ پہنچا ہے۔ میری ہی

Taj Tahir Foundation

بے توجہی سے تمہاری بیماری اس حد تک پہنچ گئی۔ میں نے کبھی تمہارے دل کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش نہ کی۔ اور نہ ہی تم نے اس کی کوئی ضرورت سمجھی۔ لیکن آج میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ کہ کس وجہ سے میں تین سال تک تمہارے قریب ہوتے ہوئے بھی تم سے اتنا دُور رہا۔ اور آج بھی شاید تمہیں نہ بتاتا۔ اگر یکایک میرے دل میں تمہاری محبت کی چنگاریاں نہ سُلگ پڑتیں۔"

تقریباً آٹھ سال ہوئے ایک دفعہ میں نتھیا گلی سے مَری آرہا تھا۔ لاری ڈونگا گلی کے قریب ٹھہری۔ تو اس میں چند افراد پر مشتمل ایک خاندان سوار ہوا۔ اسی خاندان میں ایک لڑکی تھی جسے دیکھتے ہی میرے دل نے کہا۔

"اے محبت کے لطیف جذبو جاگو۔ حُسن کی دیوی تمہارے استقبال کیلئے آئی ہے۔"

میری نگاہیں اس کے چہرے پر اس طرح گڑ گئیں۔ جیسے میری ساری ہستی ان میں سما کر اس کی رعنائیوں میں گم ہو جانا چاہتی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا۔ ایسا کرنے سے اس کے رشتہ دار کیا سمجھیں گے۔

لیکن میں مجبور تھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور میری رُوح گویا

Taj Tahir Foundation

دونوں جہان کی لطافتوں سے بہرہ اندوز ہو رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم تھا۔ اور آنکھوں میں چمک! میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور ایک نشہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس سے پہلے بھی میں نے سینکڑوں لڑکیاں دیکھی تھیں۔ لیکن کبھی میری یہ حالت نہ ہوئی تھی۔

لاری سرسبز پہاڑوں کی بل کھاتی ہوئی سڑک پر بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے میں محو محبت کی پُر اسرار وادی میں گھوم رہے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی اس کے زانوؤں پر سر رکھے بیٹھی نیند سو رہا تھا۔ اور وہ کبھی کبھی اپنی مخروطی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگتی۔ اس وقت مجھے یوں احساس ہوتا جیسے اس ننھے کی بجائے میں اپنا سر اُس کے زانوؤں پر رکھے ہوئے ہوں۔ اور وہ میرے بالوں میں اپنے نازک ہاتھوں سے شانہ کر رہی ہے۔ جب کبھی میری اس کی نگاہیں چار ہوتیں۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ایسے آنسو جن پر میری تمام خوشیاں نثار تھیں۔ جن کے بہہ جانے سے مجھے اپنے دل کی تمام کدورتیں دُھلتی ہوئی نظر آتیں۔ آنکھ جھپکتے ہی تمام سفر ختم ہو گیا۔ میں لاری سے اُترا تو کس قدر خوش و خرم تھا۔ گرد و نواح کی ہر چیز خنداں و شاداں تھی۔ چیل کے بلند و بالا درخت سرمستی و سرشاری میں جھوم جھوم جاتے تھے

بادلوں کے سرمئی اور سفید ٹکڑے فرطِ انبساط میں آسمان پر بکھرتے چلے جاتے تھے۔ ہوا میں ایک ترنم تھا۔ پہاڑیاں بنی ٹھنی کنواریوں کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کسی خوش آئند تصور میں کھڑی تھیں۔

لاری سے مسافر اُتر رہے تھے۔ اور میں ایک طرف کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ آخر کار وہ بھی اُتری اور ایک بار پھر اس نے مجھے دیکھا۔ نظروں ہی نظروں میں مَیں نے اسے آخری پیغام دیا۔ مجھے بھولنا مت میں تمہیں حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ پھر وہ اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ چل دی۔ میری نگاہیں اس کے تعاقب میں دُور تک اس کے ساتھ گئیں اور آخر تھک کر لوٹ آئیں۔

اس دن کے بعد وہ میری زندگی پر بُری طرح چھا گئی۔ میں سوتے جاگتے اُسے ہی دیکھا کرتا۔ میرے تخیل نے اس کے احساسِ حسن کو لے کر ایک ایسا مجسمہ تراشا جو فطرت کی تمام رعنائیوں کا مرقع تھا۔ اب میں اس لڑکی سے محبت نہیں کرتا تھا بلکہ میں اپنی تخلیق سے محبت کرتا تھا۔ ایسی تخلیق جو تمام کوتاہیوں سے مبرا تھی۔ میری شاعری اس کے گرد گھومنے لگی میں اسے ہی یاد کرتا۔ اسی کے لئے تڑپتا اور اسی کے گُن گاتا۔ پانچ سال گزر گئے۔ میرے

Taj Tahir Foundation

عزیزوں نے میری شادی کرنے کی ٹھانی۔ میں نے انکار کر دیا۔ "میں صرف اسی لڑکی سے شادی کروں گا۔ جس کی ضیا باریاں میرے سینے کو منوّر کر چکی ہیں۔" میں کہتا

لیکن زیادہ دیر میں ان کے اصرار کا مقابلہ نہ کر سکا۔ میری شادی تمہارے ساتھ کر دی گئی۔ لیکن میں نے تمہیں کبھی جی بھر کر نہیں دیکھا۔ میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ میں تو صرف اپنی تخلیق سے محبّت کرتا تھا ـــــ لیکن نہیں عذرا ٹھہرو ! آج مجھے وہ خدّ و خال اُبھرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ جس پر میں نے اپنے حسین جذبات کا ملمع چڑھا دیا تھا۔ وہ آنکھیں جس کی رسیلی مرتا نے مجھے دونوں جہاں کی نعمتوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ آج پھر مجھے انہی گہرائیوں میں اتارے چلی جاتی ہیں۔ عذرا ! عذرا ! بولو کہیں تم ہی تو وہ لڑکی نہیں۔ جس نے میری دنیا میں ہیجان پیدا کر دیا تھا ؟

اور عذرا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اُسے تک رہی تھی ، جیسے کہہ رہی ہو۔ "میں تمہارے تخیل کی بھینٹ ہوں شاعر !"

Taj Tahir Foundation

شادیانے

Taj Tahir Foundation

ملازمہ نے نسرین کو کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیتے ہوئے کہا۔

"بی بی جی ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"صاحب!" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں بی بی جی"

"اچھا ان سے کہو تشریف رکھیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"بہتر بی بی جی"

نسرین ناول کے اس باب کو جو وہ پڑھ رہی تھی جلدی جلدی ختم کر کے کاؤچ سے اٹھی اور بیٹھک میں چلی آئی۔ جہاں ایک نوجوان سادہ سے کپڑے پہنے اس کا انتظار

کر رہا تھا۔

"کہیے مجھ سے ملنا ہے آپ کو؟" نسرین نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں" شاید پروفیسر صاحب نے آپ سے میرا ذکر نہیں کیا۔ میرا نام سعید ہے۔

"اوہو۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ پروفیسر اشفاق نے مجھے بتایا تھا کہ چند دنوں کے لئے ان کی بجائے آپ مجھے پڑھانے آرہے ہیں۔" نسرین نے قدرے ندامت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں آج آپ سے تعارف ہو گیا کل سے میں روزانہ اسی وقت پڑھانے آیا کروں گا۔"

دراصل سعید خود ابھی اس کالج میں پڑھتا تھا۔ جہاں اشفاق صاحب پروفیسر تھے وہ ایک غریب والدین کا بیٹا تھا جن کا سایہ مدت ہوئی اس کے سر سے اُٹھ چکا تھا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنی تعلیم کو نہایت مستقل مزاجی سے جاری رکھا۔ جب سے وہ کالج میں داخل ہوا تھا۔ پروفیسر اشفاق ہر طرح سے اس کی مدد کرتے آتے تھے۔ حتیٰ کہ دو تین سال سے وہ انہیں کے ہاں آ رہا تھا۔ پروفیسر کو چند دنوں کے لئے کہیں باہر جانا پڑا اس لئے وہ نسرین کی ٹیوشن کا ذمہ سعید ہی کے سپرد کر گئے۔

نسرین کا باپ شہر کا مانا ہوا رئیس تھا وہ بتیس دانتوں میں سے جو کچھ نکالتی اُسی

Taj Tahir Foundation

وقت پورا کر دیا جاتا۔ اچھے سے اچھے کپڑے، خوبصورت زیورات، سیر کرنے کے لئے موٹر کار، غرضیکہ اسے زندگی کی سبھی رعنائیں میسر تھیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی طبیعت میں سادگی اور شرم کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں سعید اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اور اس کے دل میں خواہ مخواہ یہ خواہش پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ کہ کاش پروفیسر کبھی نہ آئیں اور وہ زندگی بھر نسرین کو اسی طرح پڑھاتا رہے۔ ٹیوشن کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی وہ بننا سنورنا شروع کر دیتا۔ اور پانچ بجتے ہی نسرین کے گھر پہنچ جاتا۔ نسرین ہمیشہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اس کا استقبال کرتی۔ اور الماری سے کتابوں کو نکالتے ہوئے آئندہ سبق کے متعلق بات چیت شروع کر دیتی۔ سعید اس کی مدھری آواز کو سنتا ہوا ایک ایسی دنیا کے تصور میں پہنچ جاتا جہاں ہر طرف خوشیوں کے سوتے اُبل رہے ہوں۔ اور رنج و تکلیف کا نام تک نہ ہو۔ . . . . کہ دفعتہً نسرین کا کوئی سوال اسے چونکا دیتا اور وہ پھر اسی دنیا میں آ جاتا۔ جہاں سماج نے اپنے سنگین قوانین سے معصوم انسانوں کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔

نسرین کی ہرن کی سی بڑی بڑی آنکھیں ہر وقت اس کے دماغ میں چکر لگاتی رہتیں اس کی گھنی پلکوں کا خیال آتے ہی سعید پر ایک پرکیف مستی چھا جاتی وہ اپنے آپ کو سمجھاتا کہ اس کی حیثیت ایک معلم کی سی ہے۔ اسے نسرین کے متعلق ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیئے۔ لیکن

Taj Tahir Foundation

جونہی وہ نسرین کے سامنے آتا اس کی نظریں خود بخود نسرین کے چہرے کی طرف گڑ جاتیں۔ اور وہ اس کے حسن کی ملاحت کو محسوس کرتے ہوئے اس طرح کھو جاتا جیسے صحرا کا تھکا ہارا مسافر اچانک باغ میں پہنچنے کے بعد میٹھی نیند سو جائے۔ اس نے سوچا ضرور مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے —— تو کیا میں اس سے کہدوں نسرین تو میری ہے۔ میں گھنٹوں تمہارے حسین تصور سے اپنا دل بہلایا کرتا ہوں —— تجھے پانے سے میری زندگی میں نکھار آگیا ہے ... ہاں —— مجھ سے اب صبر نہ ہو سکے گا مجھے یہ راز اس تک پہنچانا ہی ہوگا۔ اسی قسم کے خیالات میں محو ایک دن وہ نسرین کے گھر پہنچا اور اس کی نوٹ بک پر یہ سطور لکھ کر لوٹ آیا۔

"نسرین میں تمہیں چاہتا ہوں اتنا! کہ شاید میں خود نہیں جانتا۔ ڈرتا تھا کہ تمہیں اس کا علم ہوگا۔ تو نہ جانے تم کیا سمجھو۔ اس لئے کتنے دن اسی کش مکش میں گذار دیئے کہ تمہیں اپنے دل کا حال کہوں یا نہ کہوں لیکن اب مجھ میں ضبط کی تاب نہیں رہی میں مجبور ہو گیا ہوں کہ تمہیں وہ سب کچھ بتا دوں جو مجھ پر بیت رہی ہے۔ گو میں تم سے دور ہوتا ہوں لیکن میری روح ہمیشہ تمہارے نزدیک رہتی ہے۔ تمہارے پاس بیٹھ کر میں دنیا کے تمام دکھ بھول جاتا ہوں۔ کیا نسرین تم بھی مجھے اپنے دل میں جگہ دے سکو گی؟ میں یہ جانتا ہوں کہ تم ایک امیر باپ کی بیٹی ہو اور میں ایک غریب طالب علم۔ جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ زندگی کے

Taj Tahir Foundation

کٹھن راستہ میں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ اور پیشتر اس کے تمہیں کوئی گزند پہنچے میری زندگی تم پر نچھاور ہو چکی ہو گی۔

فقط ...... تمہارا سعید

اس رات وہ بالکل نہ سو سکا طرح طرح کے خیالات اسے آ کر ستاتے تھے۔ کبھی سوچتا: "کہیں نسرین مجھے ٹھکرا نہ دے۔ اور اگر اس نے سچ مچ ایسا کر دیا تو میرے لئے دنیا اندھیر ہو جائے گی۔ میں ایک پل اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ تمام عمر اس کے بغیر کیسے گزارونگا پھر آپ ہی آپ سوچ لیتا کہ نسرین نے اس کی بات کا برا نہیں مانا بلکہ اس کا جیون ساتھی بننا قبول کر لیا ہے۔ تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا اور ہوائی قلعے بناتا ہوا آرزؤں کی کسی حسین وادی میں نکل جاتا۔ خدا خدا کر کے رات کاٹی۔ اور گھڑیاں گن گن کر دن گزارا۔ پانچ بجتے ہی نسرین کے گھر جا پہنچا۔ لیکن دروازے پر پہنچ کر ہمت نہ پڑی کہ اندر جائے۔ بہرحال چند منٹ غور کرنے کے بعد مکان میں داخل ہوا۔ خادمہ سے کہا کہ نسرین کو بلا دے۔ کچھ دیر بعد نسرین آگئی۔ آج اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی چاندنی نہیں کھیل رہی تھی۔ بلکہ پریشانی کا ہلکا سا نقاب بنا ہوا تھا۔ اور وہ اس کوشش میں تھی۔ کہ سعید سے ناراضگی کا اظہار کر سکے۔ لیکن یہ جیسے اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے اپنے ماتھے پر کئی شکنیں بھی ڈالیں۔ لیکن اس کے لب صرف شیرینی ہی ٹپکا سکے اور آخر اس نے اتنا کہا۔

Taj Tahir Foundation

"سعید صاحب: مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں آپ کی نہ ہو سکوں گی۔ میرے والدین میری منگنی کر چکے ہیں اور جونہی میرا بی اے کا امتحان ہوتا ہے میری شادی کر دی جائے گی۔"

سعید کو ایک لحظہ کے لئے یوں احساس ہوا جیسے کسی شدید زلزلے نے اس کی زندگی کی بنیادوں کو ہلا دیا ہو۔ وہ ایک دم اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ گھر پہنچ کر سامان باندھا پروفیسر اشفاق کے لئے ایک رقعہ لکھا اور گاؤں چلا گیا۔

خط میں لکھا تھا۔

محترمی!

"مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں آپ کا انتظار نہ کر سکا اس کی اصل وجہ تو شاید میں کسی اور موقعہ پر بیان کر سکوں لیکن اس وقت یہی بتا سکتا ہوں کہ شہر کی فضا میں امتحان کی تیاری اچھی طرح نہیں ہو سکتی میں چاہتا ہوں کہ دو تین مہینے مکمل طور پر پڑھائی کی طرف توجہ دے سکوں اس لئے شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ امید ہے آپ میری مجبوری کا خیال کرتے ہوئے کسی غلط فہمی کی بنا پر میری طرف سے اپنا جی میلا نہ کریں گے۔"

"خاکسار سعید"

گاؤں میں اس کے والد کا چھوڑا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ مدت ہوئی اس میں رہنے والے اس دنیا سے چل بسے تھے، ایک سعید باقی تھا سو وہ بھی شہر چلا گیا۔ گھر کی حفاظت

کون کرتا؟ ہر طرف غلاظت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ مٹی کی کچی دیواریں کئی سالوں سے لپائی کو ترس رہی تھیں۔ اس کا جی نہ چاہا کہ مکان میں قدم رکھے۔ مگر کیا کرتا اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ مکان کو صاف کرایا۔ دیواروں کی لپائی کرائی اور اسی میں رہنے لگا۔

پہلے پہل اس کی طبیعت سخت اچاٹ ہوئی۔ اکیلے گھر میں اداس پڑا رہتا۔ جی میں آئی تو کچھ کھا لیا ورنہ بن کھائے ہی سو رہا۔ لیکن ایک دو ہفتہ کے بعد اس نے گھر سے نکلنا شروع کیا۔

فروری کا مہینہ تھا موسم نے خفیف سی انگڑائی لے کر بہار کی آمد کے گیت گانے شروع کر دیئے تھے۔ گیہوں کے سرسبز اور لہلہاتے ہوئے کھیت سعید کو ایک سکون سا بخشنے لگے۔ اب وہ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل جاتا۔ اور سارا دن کسی ہرے بھرے کھیت کے گوشے میں بیٹھا مطالعہ میں غرق رہتا۔ جب ذرا تھک جاتا تو کتابیں بند کر کے اپنے گرد و نواح سے محظوظ ہونے لگتا۔ اس وقت دور کسی رہٹ کے چلنے کی آواز اُسے نغمۂ جانفزا کی طرح معلوم ہوتی ۔اور جب اتفاقاً اس کی نظر کسی چہچہاتے ہوئے چھوٹے سے پرندے پر پڑ جاتی۔ تو اس کا رواں رواں خوشی سے لبریز ہو جاتا۔ وہ اپنے دل میں سوچتا یہ میں کتنا نادان تھا جو شہر کی پر تکلف زندگی پر فریفتہ ہو گیا —— کیا رکھا ہے وہاں؟ وہ امیروں کی بستی ہے وہاں روپیہ کی جھنکار نے لوگوں کے کان بہرے کر دیئے ہیں۔ اور وہ جذبات کی لطیف

راگنی کو سن ہی نہیں سکتے۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ فطرت اپنے بندوں پر کتنی مہربان ہے جو زخم دنیا والے ہزار دلاسوں سے مندمل نہیں کر سکتے فطرت اپنی ایک ہی مسکراہٹ سے اسے ٹھیک کر دیتی ہے۔"

غرض اس نے دو مہینے گاؤں کی سادہ اور فرحت بخش فضا میں اسی طرح گزار دیئے۔ امتحان میں ایک ہفتہ باقی تھا کہ وہ شہر آ گیا۔ پروفیسر اشفاق اسے دیکھتے ہی بولے "آ گئے سعید! میں تو سمجھا کہ تم اس سال امتحان دینے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"جی نہیں۔ میں تو امتحان کی مکمل تیاری کر کے آیا ہوں۔"

وہ خوش ہو گئے۔

کچھ دیر گاؤں میں رہنے کے بعد اس کی طبیعت ہریاول سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ شہر کی پکی عمارتیں اور بے آب و گیاہ سڑکیں اسے بالکل عجیب دکھائی دیتی تھیں۔ اسی لئے صبح ہوتے ہی وہ شہر کے کسی باغ میں چلا جاتا۔ اور تمام دن اپنی کتابوں میں مگن رہتا۔ شام ہوتی تو لوگوں کی آمد سے ہر طرف چہل پہل ہو جاتی۔ وہ کتابیں چھوڑ خود بھی اِدھر اُدھر گھومنا شروع کر دیتا۔ جب سیاہی زیادہ پھیلنے لگتی تو ٹہلتا ہوا گھر آ جاتا۔

ایک شام جب کہ وہ مطالعہ میں محو تھا۔ جونہی اس نے نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے ایک لڑکی ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی کچھ بُن رہی ہے! اسے ایک بار دیکھنے کے بعد وہ پھر پڑھنے

میں مشغول ہوگیا۔ لیکن اس کی نظریں لفظوں پر جم نہ سکیں۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی صورت آجاتی۔ جیسے وہ اس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے پھر ایک دفعہ لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ نسرین تھی۔ کچھ دیر بعد نسرین نے بھی نظریں اٹھائیں۔ دونوں نے ایک لمحہ کے لئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر نسرین کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔

" یہ ایسی کرسی پر کیوں بیٹھی ہے ؟" سعید نے اپنے دل میں سوچا۔

" اس قسم کی کرسیاں تو میں نے سینی ٹوریم میں دیکھی تھیں۔ اور ان پر ایسے مریض بیٹھے ہوئے تھے جو چلنے پھرنے سے عاجز تھے " یہ خیال آتے ہی اس کے دل پر جیسے بجلی سی گر ی۔

" نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ضرور کوئی اور بات ہوگی "۔ وہ بے اختیار اٹھا اور نسرین کے پاس چلا آیا۔

کچھ دیر وہ دونوں خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر سعید بولا۔

" خیریت تو ہے۔ آپ اس کرسی پر بیٹھی ہیں ؟"

نسرین نے حسرت بھری نگاہ سے اپنی ایک ٹانگ کی طرف دیکھا۔

" اوہ! یہ تو مصالحے کی بنی ہوئی ہے یہ کیونکر ہوا ؟"

نسرین کی آنکھوں میں آنسو آگئے قریب تھا کہ وہ ڈھلک کر اس کے رخساروں تک

Taj Tahir Foundation

آجاتیں کہ سعید نے کہا۔

"کوئی حادثہ پیش آگیا تھا کیا؟"

"جی ہاں! ایک دن شکار کرنے کے بعد والد صاحب گھر لوٹے بارش کی وجہ سے ان کے تمام کپڑے شرابور ہو رہے تھے، آتے ہی بندوق کو میری چارپائی کے ساتھ کھڑا کر کے خود کپڑے بدلنے چلے گئے۔ رات کافی گزر چکی تھی، اور میں گہری نیند سو رہی تھی والد صاحب کو یاد نہ رہا کہ بندوق گولیوں سے بھری ہوئی ہے اس لئے وہ اسے خالی کئے بغیر اپنے کمرے میں جا کر سو رہے۔ چار بجے کے قریب نہ جانے کیسے اس کی لبلبی پر دباؤ پڑا۔ اور وہ چل گئی۔ ایک دم میری چیخ نکلی اور میں درد سے کراہنے لگی۔ گولی میری ٹانگ میں لگ چکی تھی۔ اسی وقت ابا جان ڈرتے ہوئے میرے کمرے میں آئے۔ دیکھا تو میری ٹانگ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ ڈاکٹر کو فون کیا کچھ دیر بعد وہ آگیا۔ زخم کو دیکھنے کے بعد بولا بہتر ہو اگر اسی وقت ہسپتال پہنچا دیا جائے۔ ابا جان فوراً مجھے ہسپتال لے گئے۔ مہینہ بھر علاج ہوتا رہا، لیکن ٹانگ کی حالت خراب سے خراب تر ہو گئی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ کہ آدھی ٹانگ کٹوا دینی چاہئیے۔ ورنہ زہر سارے جسم میں سرایت کر جائے گا۔ اور مریضہ کی حالت خطرے میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ٹانگ کٹوا دی گئی۔ اور اب آپ مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہیں۔"

"اوہو! بہت بُرا ہوا یہ تو" سعید نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ یہاں اکیلی آئی ہیں کیا؟"

"نہیں نصیبن میرے ساتھ ہے یہیں کہیں گھوم رہی ہوگی"

"وہ دیکھئے آگئی"

"سلام بابو جی" نصیبن نے سعید کو دیکھتے ہی کہا۔

"کہو کیا حال ہے۔ خوش تو ہو"

"ہاں بابو جی۔ خدا کا شکر ہے۔ کہاں رہے اتنے دنوں آپ؟ بٹیا رانی آپ کو بہت یاد کرتی رہیں"

نسرین نے نصیبن کو گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "کیوں فاش کرتی ہو میرے دل کا راز؟"

"اچھا اب چلیں نصیبن دیر ہوگئی" نسرین نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔

"چلو۔ بی بی جی" نصیبن نے کہا۔

سعید بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

کچھ دیر وہ تینوں بالکل خاموش چلتے رہے۔ پھر نسرین نے کہا۔

"سعید صاحب! آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟"

Taj Tahir Foundation

"جی!" وہ جیسے کسی گہری سوچ سے چونکا۔

"ہاں بابو جی۔ آپ ہماری خاطر کیوں پیدل چلتے ہیں؟" نصیبن بولی۔

"نہیں نصیبن، میں خود اس وقت پیدل چلنا چاہتا ہوں۔" پھر اسی طرح خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں وہ باغ سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گئے۔

"کہو نصیبن تمہاری بی بی جی کی شادی ہونے والی تھی۔ کیا بنا اس کا؟" سعید نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"بننا کیا تھا بابو جی۔ سب کھیل ہی بگڑ گیا ــــــ قسمت پھوٹ گئی بیٹا رانی کی۔"

"وہ کیسے؟" سعید نے قدرے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکے نے شادی سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا.....۔" وہ اس کے بعد کچھ نہ کہہ سکی اور دوپٹہ سے آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔

"کیا کہا اس نے؟"

"کہ میں ایک اپاہج سے شادی کر کے اپنی زندگی کو اجیرن نہیں بنانا چاہتا۔" نصیبن نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

سعید کے دل کو ایک ٹھیس لگی۔ لیکن فوراً ہی کسی خوش آئندہ تصور نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

Taj Tahir Foundation

وہ ان کے ساتھ چلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نسرین کا گھر آ گیا۔ سعید نے اجازت چاہی۔

لیکن نسرین اسے اندر لے گئی۔ برآمدے میں پہنچ کر نصیبن ان سے علیحدہ ہو گئی۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ تشریف رکھئے" نسرین نے کہا۔

"جی ہاں" اور وہ پاس ہی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

لیکن بیٹھتے ہی پھر انہیں خیالات میں کھو گیا۔ اور نسرین اس کے چہرے پر ٹکٹکی لگائے کسی نامعلوم جذبے کا احساس کرتی رہی۔

پھر سعید بولا۔

"نسرین میری یہ سب سے بڑی آرزو تھی کہ تم میری ہو جاؤ۔ لیکن تم نے انکار کر دیا۔ شاید قدرت میرا امتحان لینا چاہتی تھی۔ میں نے تو سینے پر صبر کی سل رکھ لی تھی۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تمہاری منگنی ٹوٹ گئی۔ اب مجھے ایک اور موقعہ ملا ہے کہ میں تمہیں اپنا بنا سکوں۔ اگر اب بھی تم نے مجھے ٹھکرا دیا تو پہلے تمہاری مجبوری میری نظر میں تھی اب اپنی بے مائیگی کا یقین ہو جائے گا"

نسرین اس کے جذبات کی روانی میں خود بھی بہہ گئی تھی جب وہ خاموش ہوا تو بولی۔

"سعید صاحب! آپ اپنی زندگی کو دوبھر بنا لیں گے۔ میری اپاہج زندگی آپ کے لئے ایک قید بن جائے گی۔ آپ چاہیں گے اس کی سلاخیں توڑ سکیں لیکن یہ آپ کے بس کی

Taj Tahir Foundation

بات نہ ہو گی ــــــــ اس وقت یہ کیفیت میرے لئے اور بھی تکلیف دہ ہو گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ میرا خیال چھوڑ دیں اور اپنی زندگی کو دشوار نہ بنائیں "

"نسرین تم یہ غلط سمجھتی ہو کہ تم میری زندگی کے لئے بار بن جاؤ گی ــــــــ کیا ہوا جو فطرت نے تمہارا ایک عضو چھین لیا ہے۔ میری محبت تو مجھ سے نہیں چھینی وہ اسی طرح قائم ہے۔ اور مرتے دم تک قائم رہے گی۔ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر جیوں گا۔ اور عمر بھر تمہیں احساس نہیں ہو گا۔ کہ تمہارا ساتھی تم سے اُکتا گیا ہے۔ میری محبت تمہیں یہ ثابت کر دے گی۔ کہ ٹانگ نہ ہوتے ہوئے بھی تم کس مزے سے اپنی زندگی کا سفر طے کر رہی ہو"

اس کے بعد نسرین کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے چہرے پر حیا کی ایک ہلکی سی لہر آئی۔ اور اس نے آہستہ سے سر جھکا دیا۔

Taj Tahir Foundation

رُکے دھارے

Taj Tahir Foundation

شہر کے گنجان ترین حصّے میں چھوٹے سے مکان کی سب سے نچلی چھت میں مٹی کا ایک مدھم سا دیا جل رہا ہے۔ قریب ہی نجو ڈنڈ پیل رہا ہے، اس کا تیل ملا جسم پیہم ورزش سے پوری طرح شرابور ہو چکا ہے لیکن وہ بدستور ڈنڈ پیلے جا رہا ہے، جب وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر چھاتی کو زمین کی طرف لے جاتا ہے۔ تو اس کی رانوں اور ٹانگوں کے پٹھے لوہے کی طرح سخت ہو جاتے ہیں، لیکن جونہی وہ چھاتی اوپر اٹھاتا ہے، اس کے پٹھوں میں متوازن سی پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ ایک لچک پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی اصلی حالت پر آجاتے ہیں، دیئے کی مدھم روشنی کمرے کے چاروں طرف پھیل کر ایک ایسا منظر پیش کر رہی ہے،

جو قدرے بھیانک بھی ہے، اور خوش گوار بھی، کمرے کی تمام چیزوں پر نظر دوڑانے سے کسی تھرڈ کلاس مال گودام کا گمان ہوتا ہے،

ایک طرف چند ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں پڑی ہیں، اور دوسری طرف کچھ زنگ خوردہ سائیکلوں کے فریم، اور پھٹے پرانے ٹائر بکھرے پڑے ہیں، یہ شاید نجو کے والد کا ترکہ ہے۔ جو برسوں سے یوں ہی پڑا اگل سڑ رہا ہے،

نجو کے کسرتی جسم کا سڈول پن دیکھ کر طبیعت ایک گونہ فرحت محسوس کرتی ہے۔ لیکن اس کی ایک آنکھ کا ڈیلا پھٹے ہوئے باسی انگور کی طرح باہر نکلا ہوا ہے، جس نے اس کے چہرے کی ساری خوب صورتی کو مٹی میں ملا دیا ہے، وہ خوش مزاج اور ہنس مکھ ہے۔ محلے کے بزرگ اس کی بے حد عزت اور احترام کرتے ہیں۔ اس کے ساتھیوں کو نجو کی پہلوانی پر ناز ہے۔ اور جب کبھی وہ ان کی محفلوں میں شریک ہوتا ہے، ان کی زبانیں اس کی تعریف میں رطب اللساں ہو جاتی ہیں۔

اس کی ایک بوڑھی ماں بھی ہے۔ جس کا جھریوں سے آلودہ چہرہ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔ اور جب نجو گھر میں قدم رکھتا ہے۔ تو اس کی بوڑھی تتلی زبان سے اپنے بیٹے کے لئے اس قدر دعائیں نکلتی ہیں۔ کہ خلوص سے زیادہ اُن کے مشینی ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ لیکن نجو کو اپنی بوڑھی ماں کی کوئی بات

ناگوار نہیں گزرتی۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو جب وہ لوکو شاپ سے اپنی تنخواہ پاتا ہے تو سیدھا اپنی ماں کے پاس پہنچ کر سارے پیسے اُس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے۔ اور اس کی بوڑھی ماں زر کی زندگی بخش حرارت کو محسوس کرتے ہوئے ایک ایسی دنیا میں نکل جاتی، جہاں اس کی خوب صورت بہو اپنے ننھے ننھے بچوں کے ساتھ اس کی خدمت گزاری میں مصروف ہے۔

اچانک ایک بچہ کھیلتا ہوا آتا ہے۔ اور دادی اماں کی گود میں گر جاتا ہے۔ وہ اسے اپنی چھاتی سے چمٹا لیتی ہے۔ اُسے اپنی جوانی کے وہ غیر فانی لمحے یاد آنے لگتے ہیں جب نجو اُس کا اپنا بیٹا اتنی ہی عمر کا تھا۔

اتنے میں نجو بڑی نرمی اور پیار سے بوڑھی ماں کے کندھوں کو ہلاتا ——

اور وہ اپنے تصورات سے چونک کر نجو کو دعائیں دینے لگتی۔

پھر نجو کہتا "ماں اب میں اکھاڑے چلا"

"اچھا۔ پر دیکھو میرے چاند دیر مت کرنا۔ جب تک تم گھر واپس نہیں آتے میرا جی ڈوبتا رہتا ہے"

اور نجو سیڑھیوں سے اُترتا ہوا اپنی گونج دار آواز میں کہتا۔

"بہت اچھا ماں۔ جلد لوٹ آؤں گا۔ فکر مت کرنا"

نجو کی ماں کی ننھی منھی خواہشات نے ابھر کر اب ایک مکمل ارادے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شہر میں اس کے کئی رشتہ دار تھے سبھوں کی لڑکیاں اُس کی دیکھی بھالی تھیں۔ نمکین اور صبیح، دراز قد اور پستہ قامت، لیکن وہ کس کے گھر اپنے بیٹے کا سوال لے کر جاتے۔ یہ سوال اس کے زیر غور تھا۔

"کوئی امیر گھرانہ ڈھونڈنا چاہئے"، وہ سوچتی۔

"نہیں"، اور پھر خود ہی اپنی اس رائے کی تردید کرتے ہوئے بڑبڑانے لگتی۔

"امیر گھرانوں کی لڑکیاں بڑی نک چڑی ہوتی ہیں مجھے تو ایک شریف اور خدمت گزار بہو چاہئے۔ خواہ کسی غریب خاندان ہی کی کیوں نہ ہو —— چاند سی دلہن لاؤں گی اپنے بیٹے کے لئے۔"

آخر سوچتے سوچتے اس نے ایک ایسا گھرانہ ڈھونڈ ہی لیا۔ جہاں اس نے اپنے بیٹے کے بیاہ کا تہیّہ کر لیا۔

اسی دن شام کے وقت جب نجو مسجد کے کنوئیں سے نہا دھو کر واپس گھر آیا۔ تو اُسے اپنی ماں معمول کے خلاف کچھ افسردہ سی نظر آئی۔ وہ ایک معصوم بچے کی طرح اپنے دونوں ہاتھ ماں کے گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے ماں! اتنی گُم سُم کیوں بیٹھی ہو۔"

Taj Tahir Foundation

"کچھ نہیں میرے لال - یُونہی ــــــ"۔

"یُونہی کیا!" نجّو نے قدرے جھنجلاہٹ سے اپنی ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

لیکن ماں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

چند ہی لمحوں کے بعد اُس نے خود بخود بولنا شروع کر دیا۔

"اُونہہ! میرے ہیرے جیسے بیٹے میں عیب نکالنے والیں۔ مجھے کیا ان کے سوا اور کوئی بَر ہی نہ دے گا۔ ایسی بہو لاؤں گی کہ دیکھ دیکھ کر جلیں گی"۔

نجو آہستہ سے اپنی ماں کے گھٹنوں پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی سمجھ میں پوری بات تو نہ آئی تھی۔ تاہم وہ کچھ کچھ سمجھ ضرور گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"ماں تم میری شادی کی فکر نہ کرو"۔

"کیوں نہ کروں میرے بچے!" ماشاء اللہ اب تم جوان ہو گئے ہو۔ تمہاری شادی تو ہو ہی جانی چاہیئے"۔ اس نے نہایت ملائم اور پیار بھری آواز میں کہا۔

اس ایک ناکامی کے بعد نجو کی ماں نے کتنی اور کوششیں کیں۔ لیکن ہر بار اُسے پہلے سے زیادہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنے بیٹے کی نیک چلنی اور پارسائی پر بہت اتراتی تھی۔ لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں تنہا ان صفات کا کوئی

خریدار نہیں۔

آہستہ آہستہ اُس کا غرور ٹوٹنے لگا۔ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنے بیٹے کی شادی کے لئے دعائیں مانگتی۔ اور بار بار اس کی شکل کو دیکھتی۔ لیکن اسے نجو کی صورت میں کوئی عیب بھی تو دکھائی نہ دیتا۔ اس کی ایک آنکھ خراب تھی۔ لیکن وہ اسے پھر بھی چاند ہی کہتی۔ اسے اپنا بیٹا دنیا کے تمام نوجوانوں سے خوبصورت معلوم ہوتا۔ لیکن یہ سب کچھ اس کی اپنی رائے تھی۔ دوسرے تو نجو کو اس نظر سے نہیں دیکھتے تھے پھٹے ہوئے انگور کی طرح اس کا باہر نکلا ہوا ڈیلا انہیں اپنی لڑکیوں کے ماتھوں کا کلنک دکھائی دیتا۔ اسی لئے وہ بڑھیا کو صاف صاف انکار کر دیتے تھے۔

نجو اپنی ماں کی تگ و دو میں مسلسل ناکامیوں کو دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھتا تھا وہ جذبات جن کا احساس اُس نے آج تک نہیں کیا تھا۔ یکایک جیسے ایک جھٹکے کے ساتھ گہری نیند سے چونکا دیئے گئے تھے۔ اسے اپنے اعضا میں ایک تشنج اور گھٹی گھٹی سی دکھن محسوس ہونے لگی تھی۔ کسرت اور ریاضت کی زندگی سے اُسے ذرہ برابر لگاؤ نہ رہا تھا۔ ورکشاپ سے آنے کے بعد وہ اَب اکھاڑے میں نہیں جاتا تھا۔ بلکہ آتے ہی میلے کچیلے کپڑوں سمیت چارپائی پر لیٹ جاتا۔ جیسے

تھکاوٹ سے چُور چُور ہوگیا ہو۔ زندگی میں اس سے پہلے اس نے کبھی اتنا ہیجان محسوس نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی اس سے پہلے کبھی اُسے اس قدر پژمردگی اور نقاہت کا احساس ہُوا تھا۔

اتوار کی ایک شام کو جب وہ نہا دھو کر گھر سے باہر نکلا تو اسے چند پرانے ساتھی مِل گئے۔ انہوں نے اسے گھیر لیا اور طرح طرح کے سوال پوچھنے شروع کر دیئے۔

"بیمار ہو گئے تھے کیا؟"

"نہیں تو ——"

"پھر کسی لونڈیا سے عشق کر لیا ہے۔"

اور جیسے کسی نے اس کی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا۔ اس کے چہرے پر غصّے اور غم کی مِلی جلی کیفیت ایک لَو بن کر چمک اُٹھی۔ مگر اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ ایک بھٹی تھی جو اس کے اندر دہک رہی تھی۔ لیکن بظاہر بُجھی ہوئی راکھ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

باتوں باتوں میں بجو کے ایک دوست نے کہا: "چلو یار آج تمہیں پان کھلائیں۔ کیا گھمبیر لونڈیا ہے۔ اللہ قسم دیکھو گے تو کلیجہ مسوس کر رہ جاؤ گے۔

Taj Tahir Foundation

کیا بھرا بھرا جسم ہے کم بخت کا۔ جب باتیں کرتی ہے تو ننھے گڑھے اُس کی دونوں گالوں میں پڑ جاتے ہیں"

بجو نے تصور ہی تصور میں اپنے بھوکے جذبات کو ایک ایسے دسترخوان پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جہاں طرح طرح کی لذیذ غذائیں نہایت قرینے سے چُنی ہوئی ہوں۔ اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کی بھوک میں بے پناہ اضافہ کر رہی ہو ۔ یا اُس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ایک ایسے پُراسرار جزیرے میں پہنچ گیا ہے۔ جہاں کی ہر چیز اُسے ایک مقناطیسی قوت کی طرح اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔

وہ فوراً بولا۔

"ہاں شبو آج پان ضرور کھائیں گے۔"

"اُسی چھوکری سے؟ اسی لونڈیا سے؟"

"ہاں اسی لونڈیا سے" اُس نے نہایت فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

جُوں جُوں وہ پان والی کی دکان کی طرف بڑھتے جاتے تھے بجو کا دل خوشی سے اُچھل اُچھل جاتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ اس بازار سے گزر کر شہر کی پیچ در پیچ گلیوں میں گھومتے ہوئے ایک اور بازار میں آ گئے۔ یہ وہی بازار تھا،

Taj Tahir Foundation

جسے شریف لوگ لُچا بازار کہتے ہیں۔ دو تین دکانوں کو چھوڑ کر ایک چھجے دار مکان کے نیچے اسی پان والی کی چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ آلتی پالتی مارے نہایت لاابالی کے ساتھ ان راہ گیروں کو دیکھ رہی تھی۔ جو آنکھیں مٹکاتے، سگریٹ کے کش لگاتے۔ مزے مزے سے بازار کی سیر کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ بغیر کسی وجہ سے مسکرا کر اپنی بھاری بھاری پنلیوں کو نیچے جھکا لیتی۔

نجو کا دوست آگے بڑھا۔

"اری شبراتن آج پہلوان کو پان کھلا دے۔ دیکھنا لاج رہ جائے ہماری۔ شہر کے دوسرے حصے سے کھینچ کر نجو میاں کو یہاں لایا ہوں"۔ شبراتن نے ایک اچٹتی ہوئی نظر سے نجو کو دیکھا۔ اور پھر پان کی گلوری بنانے میں مصروف ہو گئی۔ اس دوران میں نجو نے ایک لحظے کے لئے بھی اپنی نظر کو اس کے چہرے سے نہ ہٹایا۔ اس کا جسم واقعی بھرا ہوا تھا۔ بلکہ اعتدال سے کہیں زیادہ گدگدا اور پلپلا سا تھا۔——

اس کے جسم میں پھر اُسی پُرانے تشنج کا احساس ہوا۔ اور اُس نے غیر ارادی طور پر ایک آہ بھری اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

نجو نے پان کی گلوری لینے کے لئے جب اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ تو اس کی انگلیاں شبراتن کی انگلیوں سے چھوئیں اس لمس سے نجو کے جسم میں بجلیاں سی دوڑ گئیں

وہ بالکل بے حس وحرکت کھڑا تھا۔ شبراتن اپنی عادت کے مطابق مسکرائی اس کے گالوں میں واقعی دو ننھے منھے گڑھے پیدا ہوئے۔ اور بجو اپنے منہ میں پان ڈالتے ڈالتے رہ گیا۔

بجو کے دوستوں کے لئے یہ بالکل اچنبھے کی بات تھی۔ آخر بجو شبراتن کو دیکھ کر اس قدر مبہوت و نیم جان کیوں ہو گیا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

اس دن کے بعد بجو روز وہاں آنے لگا۔ پہلے پہل تو صرف پان خریدتا۔ اور چلا جاتا۔ لیکن کچھ روز گزرنے کے بعد وہ دکان کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ بھی جاتا۔ اور کئی کئی گھنٹے شبراتن سے باتیں کرنے میں گذار دیتا۔ آخر ایک دن ایسا آیا۔ جب بجو نے شبراتن کو زینہ بنا کر ایسی زقند بھری کہ سیدھا پیپ اور خون کے دریا میں آ رہا۔ اب وہ اپنی دہکتی ہوئی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے فاحشہ عورتوں کے مکانوں پر بے کھٹکے جاتا۔ اس کی زندگی ایک ایسے دوزخ میں بدل گئی تھی جس میں دن رات وہ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح ابلتا رہتا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ بجو کا سارا جسم رستے ہوئے ناسوروں سے بھر گیا ہے۔ جہاں بیٹھتا ہے۔ مکھیاں گندگی کا ڈھیر سمجھ کر اس کے چہرے کے ارد گرد منڈلانا شروع کر دیتی ہیں۔ تعفن کی وجہ سے لوگ اس کے قریب تک نہ

Taj Tahir Foundation

پھنکتے۔ اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہوگئیں۔

اس کی بوڑھی ماں جب کبھی اس کے اضطراب کو دیکھتی۔ تو اسے اپنی بے سروسامانی کا بُری طرح احساس ہونے لگتا۔ وہ سمجھتی شائد نجو کی شادی نہیں ہوسکی۔ اسی لئے وہ یوں مضطرب اور پریشان سا رہتا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ کہ اس کا نجو ایک ایسے مُہلک مرض میں مبتلا ہو چکا ہے۔ جو لحظہ بہ لحظہ ایک تیزابی مادے کی طرح اس کی بوٹی بوٹی نوچ رہا ہے۔ جب کبھی وہ نجو کو رات کے وقت کراہتے اور سسکتے ہوئے سنتی۔ تو وہ اس کی چارپائی کے قریب آکر اسے گلے سے لگالیتی۔ اور وہ دفعتہً پکار اُٹھتا۔

"ماں مجھ سے دُور رہو۔ ورنہ ———————"

"ورنہ کیا!" وہ اُس کے اشارے کو سمجھے بغیر اسے اپنی چھاتی سے اور بھی شدت کے ساتھ چمٹا لیتی۔ اور اپنے بوسوں سے اُس کے سارے جسم کو نم آلود کر دیتی۔

رات کا درمیانی حصہ تھا۔ گو موسم گرما تھا۔ لیکن ہوا کے چلنے سے فضا قدرے خوشگوار ہوگئی تھی۔ نجو اپنے زخموں کی تاب نہ لاکر ہولے ہولے کراہ رہا تھا اور اس کی ماں کی نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی تھی۔ نہ جانے آج وہ اس کی تکلیف سے پریشان ہو کر اس کے پاس کیوں نہیں گئی۔ بلکہ جی کڑا کر کے اسے اپنی چارپائی پر مسلسل کروٹیں بدلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسے یوں احساس ہوتا تھا۔ جیسے نجو انگاروں کے

بستر پر لوٹ رہا ہے۔ اور پھر یکایک وہ کیا دیکھتی ہے۔ کہ نجو بڑی آہستگی سے اپنی چارپائی سے اٹھا۔ آرام سے اپنی جوتی زمین سے اٹھا کر پہنی۔ اور بغیر کسی آہٹ کے قدم رکھتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ وہ فوراً چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

یا اللہ یہ کہاں گیا! چاہتی تھی کہ اُسے آواز دے کر بُلائے لیکن خیالات کے ہجوم نے جیسے اس کی قوت گویائی کو سلب کر لیا ہو۔ وہ چارپائی سے نیچے اُتر کر مکان کے سرے پر آ کھڑی ہوئی۔ اور نیچے گلی میں دیکھنے لگی۔ دو ہی منٹ کے بعد نجو نمودار ہوا۔ اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گلی کے گھپ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ نجو رات کے اس پہر میں کہاں جا سکتا ہے لیکن فوراً ہی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے دماغ میں ایک ایسا خیال آیا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

صبح اٹھ کر نجو کی ماں بالکل خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ نجو بے قصور ہے۔ البتہ اس رات کے واقعہ کے بعد اس کے سر پر جیسے اپنے بیٹے کی شادی کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ انہیں دنوں ان کے محلے کے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں کوئی مہاجر خاندان آ کر آباد ہوا۔ نجو کی ماں نے سنا۔ ان کی ایک جوان بیٹی بھی ہے۔ حسن اور

Taj Tahir Foundation

خدمت گزاری کی جن صفات کو اس نے اپنے بیٹے کی ہونے والی دلہن کے لئے لازمی سمجھ رکھا تھا۔ اب وہ اس کی نظروں سے بالکل محو ہو چکی تھیں۔ وہ صرف ایک لڑکی چاہتی تھی۔ اپنے بیٹے کی جنس مخالف۔ جو اس کے اُبلتے ہوتے جذبات کی تسکین کر سکے۔ وہ بغیر کسی تاخیر یا ہچکچاہٹ کے ان کے ہاں جا دھمکی۔ مہاجر بے چارے لٹ لٹا کر بے یار و مددگار وہاں پہنچے تھے۔ اس کے علاوہ وہ پہلے ہی کونسی جاگیروں کے مالک تھے۔ جو اب تہی دست ہو کر کسی غریب خاندان میں اپنی بیٹی کو بیاہنے سے گریز کرتے لڑکا دیکھا نہ کچھ اس کی آمدنی کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ فوراً بر دینے کے لئے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ چند ہی دنوں میں شادی کی تمام متعلقہ رسموں کو پورا کیا گیا۔ اور وہ ڈولے پڑھا کر نجو کی ماں بہو کو اپنے گھر لے آئی۔

نجو کی شادی کی پہلی رات تھی۔ مسلسل بدکاری اور بے راہ روی نے اس کے بدصورت چہرے کو اور بھی زیادہ مسخ کر دیا تھا۔ اور پھر جسم پر بے شمار زخموں کی وجہ سے اس کے قریب بیٹھے ہوئے بھی گھن آتی تھی۔ وہ ململ کا ایک بڑا پگڑ اپنے سر پر رکھے، دوسوتی کی ایک نئی تہہ دار چادر کو اپنی ایک بغل کے نیچے سے نکال کر، اس کے مقابل کے کندھے پر ڈالے دلہن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک نازک گٹھڑی کی طرح سمٹی سمٹائی پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نجو کے قدموں میں

Taj Tahir Foundation

اشتیاق سے زیادہ ڈگمگاہٹ نظر آرہی تھی۔ وہ ہولے ہولے ڈگ بھرتا۔ اپنی دلہن کے پلنگ کی طرف بڑھا۔ کسی زہر آلود مادے کی طرح ایک مبہم سا خوف اسے اپنی نس نس میں سرایت کرتا محسوس ہوا۔

اس کے تمام رشتہ دار جو اس کی شادی میں شریک ہونے کے لئے آتے تھے۔ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے تھے۔ ماں بھی دن بھر کی تھکی ماندی کو ٹھے پر جاکر سو رہی تھی۔ فقط ایک نجو تھا اور اس کی دلہن جو اتنی رات گئے تک جاگ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں اپنی دلہن کو دیکھتا رہا۔ اور پھر کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے گھونگھٹ کو اوپر اٹھا دیا۔ دونوں کی نظریں چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے سے چار ہوئیں۔ اور پھر دلہن نے چیخ مار کر اپنے سر کو تکیے پر گرا دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔

نجو شاید پہلے ہی اس کا متوقع تھا۔ وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اپنی دلہن کے پلنگ سے کچھ قدم پیچھے ہٹا۔ اب جیسے اسے کسی چیز کا غم نہیں رہا تھا۔ پلنگ کے قریب دیوار پر ٹنگے ہوئے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے پگڑ کو جمایا۔ دوسوتی کی خوبصورت چادر کو سنوارا۔ پھر کھڑکی پر سے چق اٹھا کر تاروں سے بھر اور آسمان کو دیکھا ہر طرف

ایک ہُو کا عالم تھا۔ ستارے چپکے چپکے ایک دوسرے سے چشمک زنی میں مصروف تھے۔ اس نے حق ڈالتے وقت ایک نظر نیچے گلی میں بھی ڈالی۔

دو خارش زدہ کتے ایک دوسرے کے ساتھ جسم رگڑ رگڑ کر اپنی کھجلی کی تسکین کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ اس نے چٹخ ڈال دی۔ اور جس طرح ہولے ہولے ڈگ بھرتا ہوئے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اسی طرح باہر بھی نکل گیا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ جب آیا تھا تو اُمید و بیم کی زبردست کش مکش میں مبتلا تھا جب لوٹا۔ تو ناامیدی کا مکمل سکون لے کر۔ وہ بھاگ رہا تھا ———— کہاں؟ —

اسی بھیانک اور تاریک بستی کی طرف جہاں کے رہنے والے خارش زدہ کتوں سے زیادہ غلاظت اور تعفن کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جہاں بیماریاں پھوٹتی ہیں اور ناسور جنم لیتے ہیں۔ لیکن نجو کو ان چیزوں کا احساس نہیں تھا۔ وہ تو جیسے آسودگی اور استراحت کی خوشنما وادی کی جانب قدم اٹھا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "میری زندگی خوشی اور زندہ دلی کا گہوارہ تھی۔ اسے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب وہ اکھاڑے میں دنگل لڑا کرتا تھا۔ اور اپنے حریف کو گرا چکنے کے بعد کتنی شان و شوکت سے گھر واپس جایا کرتا تھا۔ اُسے اُس کے دوست زمین پر قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔ بلکہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر اُس کی فتح مندی کے گیت گاتے ہوئے خود اس کے گھر چھوڑ کر

جایا کرتے تھے ۔ ماں اُسے دیکھ کر نہال ہو جایا کرتی تھی ۔ اور بے اختیار ہو کر اُس کے بلائیں لینے لگتی تھی۔ مگر اب مسرت اور کامرانی کا وہ زمانہ ایک دھندلا سا خواب بن کر روز بروز اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا:

" ——— راحتیں ختم ہو گئیں ۔ زندہ دلی اور پاکیزگی کے مزے جاتے رہے ۔ اب گناہ ہے ! ابدی کرب، پریشانی۔ ذلت اور نحوست کے عمیق گڑھے ۔

..... مگر نہیں کچھ ہی لمحوں کے بعد اُس کے قدم خود بخود تیزی کے ساتھ اٹھنے لگے ——— اس کے خیالات کے تند و تیز دھارے نے کوئی اور ہی رُخ اختیار کر لیا تھا ——— آراستہ پیراستہ کمرہ جس کی چھت پر چینی کا بہت بڑا فانوس لگا ہوا تھا۔ جس کے فرش پر مخملیں غالیچہ اور دیواروں کے ساتھ ریشم اور اطلس کے بنے ہوئے تکئے ایک نہایت دلکش منظر پیدا کر رہے تھے ——— اور پھر ایک تھرکتا ہوا حسین و جمیل پیکر آگے بڑھا اور اس کے بھڑکتے ہوئے جذبات کے الاؤ کو دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا کر دیا۔ وہ اس زندہ مجسمے کی تبسم ریز اداؤں پر فریفتہ ہوا جا رہا تھا جو اس کے رستے ہوئے ناسوروں پر مرہم کا کام کر رہی تھی ...... "کتنی جانفزا ہے وہ بستی جدھر میں جا رہا ہوں" وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ جسے دھرتی کی کوئی چیز برداشت نہیں کرتی۔ یہاں کتنی فراخدلی سے اس کا استقبال ہوتا ہے۔ جو شعلے بھڑک بھڑک کر گھر کے در و بام کو خاکستر کرنے پر تلے ہوتے ہیں اس بستی کے رہنے والے کتنی خوشی سے ان کا ایندھن بننا منظور کر لیتے ہیں وہ دل ہی دل میں ان کی فراخدلی کے گن گا رہا تھا +

جھوٹی ماں

تجمل میرا کلاس فیلو تھا۔ شاید اُسے آخری دم تک معلوم نہ ہوا ہو کہ میں اُسے کتنا چاہتی تھی۔ کتنی ہی مرتبہ مَیں نے اُس کی بلّوری آنکھوں کی نیلگوں جھیلوں میں ڈوب کر خوشی کے اَن گنت لمحے نکالے تھے۔ اُس کے سنہری بالوں اور شفاف پیشانی سے فرشتوں کے سے شکوہ کا اظہار ہوتا تھا۔ میں اکثر کنکھیوں سے اُس کے متبسم اور دُکھی چہرے کو دیکھا کرتی تھی۔ وہ غم میں اُلجھی ہوئی رعنائی مجھے عمر بھر کبھی نہ بھُولے گی۔

اُسے زاہدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ جب میں تجمل اور زاہدہ کا جسمانی حیثیت سے مُقابل کرتی ہوں۔ تو مجھے بہت بڑا تفاوت نظر آتا ہے۔ وہ کھلتے ہوئے جسم کی

Taj Tahir Foundation

مضبوط اور توانا لڑکی تھی۔ اور تجمل بالکل ایک گڑیا کی مانند پتلا، دُبلا اور نازک سا، ہنستا تو اپنے سوا کسی کو علم نہ ہوتا۔ اور اگر روتا تو بھی کوئی نہ جانتا۔ اس کے برعکس زاہدہ ساری کلاس میں اپنی شرارتوں اور دوسروں پر غالب آجانے والی شخصیت کی وجہ سے مشہور تھی۔ اُس کا کون سا کلاس فیلو ایسا ہوگا۔ جو اس کے مزاق اور طنز کا نشانہ نہ بنا ہو۔ کیسا ہی چُبھتا ہوا فقرہ ہو۔ وہ فوراً ایسا موزوں جواب دیتی کہ فقرہ کسنے والا بغلیں جھانکنے لگتا۔

وہ کچھ اتنی خوب صورت نہیں تھی۔ قد میں مجھ سے قدرے آدھ فٹ کم، کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ لیکن نقوش کچھ تیکھے نہ بھدّے۔ بس درمیانہ سے، نچلا ہونٹ ذرا موٹا۔ لیکن جب باتیں کرتی تو دو ننھے ننھے گڑھے اُس کی دونوں گالوں میں پڑ جاتے، مجھے تو اُس وقت بالکل ڈبل روٹی کی طرح دکھائی دیتی۔ جب دیکھو کسی ہم جماعت کی مٹی خراب کرنے میں مصروف ہے۔ سنجیدگی جیسے اُسے چھُو تک نہیں گئی تھی۔ اُس کے چمکیلے گھنے بالوں کا موٹا سا جُوڑا ہر وقت اُس کی گدّی پر اس طرح جما رہتا۔ کہ اُس کی پُرتمکنت شخصیّت کا ایک لازمی جزو بن گیا تھا۔ لباس وہ ہمیشہ بھڑکیلا پہنتی۔ اُس کی گول گول موٹی آنکھیں کچھ ایسی شرارت آمیز چمک لئے ہوئے تھیں۔ کہ دیکھنے والے کو خواہ مخواہ بدحواس کر دیتیں۔ تجمل بھی کئی دفعہ

Taj Tahir Foundation

اُس کی شرارتوں اور طنز و تشنیع کا نشانہ بنا ہوگا۔ مگر وہ تھا کہ ——— بس اُسی کے خیالوں میں مگن رہتا۔ زاہدہ سے کہیں زیادہ خوبصورت لڑکیاں اُس کی دوستی کی خواہاں تھیں، اور ہو سکتا ہے میری طرح اُس سے محبت بھی کرتی ہوں۔ مگر وہ صرف زاہدہ کو چاہتا تھا۔ اس قدر کہ جس دن اُس سے باتیں کر لیتا، پھولے نہ سماتا۔ زاہدہ اُسے بسا اوقات جھاڑ بھی دیتی۔ اور وہ اپنا سا مُنہ لے کر رہ جاتا۔ مجھے اُس وقت تحمل پر بہت رحم آتا۔ اور میں کسی نہ کسی بہانے اُس کے پاس جاتی۔ اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ مگر وہ میری طرف بالکل توجہ نہ دیتا۔ اور پتھر کے حسین مجسمے کی طرح میری باتیں سنتا سنتا اپنے خیالات میں کھو جاتا۔ کلاس شروع ہونے سے پہلے جب کبھی تمام لڑکے گپ بازی میں مصروف ہوتے اور اچانک زاہدہ آجاتی تو وہ فوراً اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اور زاہدہ نہایت بزرگانہ انداز میں اُسے کرسی پر بیٹھ جانے کے لئے اشارہ کر دیتی۔ وہ سوچتا "آخر یہ مجھ سے اس طرح کیوں پیش آتی ہے۔ میرے جذبات تو اس کے لئے بالکل کسی اور ہی نوعیت کے ہیں"۔

اور ایک دن میں نے دیکھا۔ زاہدہ کلاس میں اپنے ہم جماعتوں کے درمیان شمع محفل بنی بیٹھی تھی۔ ہر ایک کی باتوں کا جواب بہت لاپرواہی اور

بے باکی سے دیئے جا رہی تھی۔ کسی کا لب ولہجہ درست کر رہی تھی، اور کسی کے لباس کی گت بنا رہی تھی۔ ہمارے ایک ہم جماعت ذرا زیادہ ہی بزرگ قسم کے واقع ہوئے تھے۔ مدتوں انہیں کسی نے ہنستے نہیں دیکھا۔ زاہدہ ان کی آؤ بھگت بڑے اہتمام سے کیے کرتی تھی۔ شامتِ اعمال آج بے چارے سیاہ چشمہ چڑھائے بالکل کسی سراغ رساں ناول کے ہیرو کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔

"واہ! واہ! کیوں بھئی نواز صاحب کلاس میں بھی آپ کو چشمہ لگانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اور پھر آج تو باہر بھی مطلع ابر آلود ہے نظر بد دور، آپ کی نرگسی آنکھوں کو ہماری نظر نہیں لگ جائے گی۔ چشمہ اتار دیجیے!"

نواز بے چارے نے ہڑبڑا کر جیسے کسی نے نیند سے چونکا دیا ہو چشمہ اُتار کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

ابھی شاید اس کی خلاصی نہ ہوتی۔ لیکن اس نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ زاہدہ کی باتوں کا جواب دینا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہے۔ کوئی اس کا ساتھ تو کیا دیتا۔ الٹا سبھی لڑکے زاہدہ کے ساتھ مل کر اس کی مٹی خراب کرنے پر تل جاتے۔

زاہدہ اسی طرح اپنے ہم جماعتوں کو اپنی شوخ و شنگ گفتگو سے متوجہ کئے ہوئے تھی۔ اور تجمل اُس کے دروازے میں کھڑا ایک کواڑ سے ٹیک لگائے زاہدہ کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُف! وہ نظریں مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ آرزوؤں کی کتنی ہی بستیاں تھیں، جو یاس و ناامیدی کے اندھیارے سے نکل کر کامرانی و شادکامی سے دوچار ہونے کے لئے ترس رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی بلوری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ آنسو جن کی کل کائنات پانی کے چند قطروں سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے پُر اسرار غم کی اتھاہ گہرائیوں کا کتنا واضح پتہ دے رہے تھے۔ میں اپنی سیٹ پر سے اُٹھی۔ دروازے میں سے گزرتے ہوئے میں نے اُسے بلانا چاہا۔ مگر اُس نے میری طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور اسی طرح گُم سُم کھڑا زاہدہ کو دیکھنے میں مصروف رہا۔ غالباً دوسرے لڑکے اور لڑکیاں اپنی گپوں میں اس قدر منہمک تھے۔ کہ انہیں تجمل کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ تھی۔ ورنہ اس دن بے چارے کا بہت مزاق اُڑتا۔

اُسی دن کالج سے چھٹی کے بعد میں اور ہماری جماعت کے دوسرے لڑکے لڑکیاں جن میں تجمل بھی شامل تھا۔ کالج کے بڑے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ ٹریفک کا تانتا بندھا ہوا تھا، اور ہم اس انتظار میں تھے۔ کہ سڑک تھوڑی دیر کے لئے خالی

ہو۔ اور ہم اُسے پار کر جائیں۔ کہ اتنے میں تجمل کے بالکل قریب ایک کار آ کر رُکی۔ اُس میں ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی جس کے خدوخال اور شکل و صورت بہت حد تک تجمل سے ملتی جلتی تھی۔ میں نے سمجھا اُس کی بہن ہو گی! اور بعد میں تجمل ہی نے جب میرا اور اس کا تعارف کرایا تو میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اُس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے تجمل کو اس میں بیٹھنے کو کہا۔ اور وہ چپکے سے کار میں داخل ہو گیا۔ ابھی کار مشکل سے سٹارٹ ہوئی ہو گی کہ پھر ٹھہر گئی۔ تجمل نے کار کی کھڑکی میں سے منہ نکال کر مجھے میرے گھر تک پہنچا آنے کی دعوت دی۔ میں نے قدرے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ سوچا ساتھ کے طالب علم کیا خیال کریں گے۔ مگر اس نے کچھ اتنے معصوم اصرار سے بیٹھ جانے کے لئے کہا کہ میں دوبارہ انکار نہ کر سکی۔

وہ تمام راستہ بالکل خاموش، افسردہ سا کار کی کھڑکی سے بغیر کسی مقصد کے دیکھتا رہا۔ اور میں تجمل کی بہن سے اُس کے کالج کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ اس کی حرکات و سکنات بھی تجمل سے بہت حد تک ملتی جلتی تھیں۔ بات بات پر مُسکرا دیتی۔ اس کی ملنسار اور نکھری ہوئی طبیعت نے بہت جلد مجھے اُس سے بے تکلف بنا دیا۔ تھوڑی دیر میں اُن کا گھر آ گیا۔ کار رُکی اور تجمل مجھے بغیر کوئی الوداعی جملہ کہے اپنی بہن سے مخاطب ہوا۔

Taj Tabir Foundation

"ثریا تم انہیں ان کے گھر چھوڑ آؤ۔"

اور خود کار سے نیچے اُتر گیا۔

شاید ثریا کو بھی یہ بات ناگوار گزری کہنے لگی۔

"نہ جانے کیا ہو گیا ہے بھیا کو۔ خاصے خوش باش اور ہنس مکھ ہوا کرتے تھے جب سے ایف۔ اے پاس کیا ہے۔ مزاج ہی بدل گئے ہیں۔ ان کے کسی سے ملکر خوش ہوتے ہیں نہ اچھی طرح گفتگو ہی کرتے ہیں۔ بے چاری امی انہیں اس قدر چاہتی ہیں، مگر یہ ان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ ابھی کل ہی وہ کہہ رہی تھیں۔

"تجمل بیٹا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ دیکھو اس طرح منہ بسورے ہوئے نہ رہا کرو۔ بچے ہنستے کھیلتے ہی اچھے لگتے ہیں۔"

مگر یہ ہیں کہ ان پر کسی کی نصیحت کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

کار چل رہی تھی۔ اور میں نے اس دوران میں گفتگو میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ باتیں کئے جا رہی تھی اور میں انہیں خاموشی کے ساتھ سنے جا رہی تھی۔ اتنے میں میرا گھر بھی آ گیا۔ میں نے کار ٹھہرائی اور ثریا کو اندر چلنے کے لئے کہا۔ مگر وہ کسی اور دن آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر چلی گئی۔

دوسرے دن جب میں پیریڈ شروع ہونے کچھ دیر پہلے میں کلاس میں

داخل ہوئی تو زاہدہ معمول سے زیادہ برانگیختہ نظر آ رہی تھی۔ اُس کی حرکات و سکنات سے پتہ چلتا تھا۔ کہ آج وہ کوئی غیر معمولی راز افشا کرنے پر تُلی بیٹھی ہے۔ لڑکے اپنی کرسیاں اٹھا اٹھا کر اس کے گرد لا رہے تھے۔ اور جو لڑکے ابھی تک اُس کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔ وہ اُن کا نام لے لے کر پکار رہی تھی۔ جب تمام لڑکے اس کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے تو اس نے ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے تجمل کو دیکھا۔ غالباً اُس نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ زاہدہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ جو چند ہی لمحوں کے بعد وہ کرنے والی تھی۔ میں ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔ لیکن جب زاہدہ نے اپنے پرس میں سے ایک لفافہ نکالا تو میرا تجسس بڑھا اور میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر زاہدہ کے قریب آ گئی۔

وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ کتنی حقارت تھی اس کی مسکراہٹ میں۔ یقیناً آج کوئی بُری طرح اس کا شکار بننے والا تھا۔ اُس نے اپنی شہادت کی انگلی سے تجمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی ذرا اس بچو نگوڑے کو دیکھئے ——— جانتے ہیں۔ یہ مجھ سے محبت کرتا ہے؟

لڑکے بالکل خاموش تھے ۔ گویا یا تو انہیں اس معاملہ کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا تھا ۔ اور یا پھر واقعی حیرت نے ان کی زبان گنگ کر دی تھی

"ہاں ۔ ہاں ۔ یہ مجھ سے محبّت کرتا ہے !" وہ پھر بولی ۔

میں نے دیکھا تجمل کے کانوں کی لویں کندن ہو رہی تھیں ۔ اُس کی سفید گالوں پر شرم کی وجہ سے وہ سُرخی دوڑ رہی تھی ۔ جس سے ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہ خیال پیدا ہوا ۔ کہیں ان سے شعلے نہ بھڑک اٹھیں ، اُس کی آنکھوں میں وہ التجا تھی ۔ جو پتھر سے پتھر دِل انسان کو بھی پانی کر دیتی ۔ مگر زاہدہ اُس کی پرواہ کئے بغیر آج اپنی ستم ظریفی کی داد لینے کا زبردست تہیہ کئے ہوئے تھی ۔ اُس نے لفافے میں سے ایک چٹھی نکالی ۔ چٹھی کو کھولا اور اپنی نگاہیں چٹھی پر سے ہٹائے بغیر اُس نے کہا ۔

"یہ چٹھی تجمل صاحب نے مجھے بھیجی ہے ۔ میرے گھر کے پتے پر ۔" اور پھر تجمل کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے ۔

"مجھے یقین ہے آپ انکار نہیں کریں گے تجمل صاحب ، آپ ہی نے یہ چٹھی بھیجی تھی نا مجھے ؟"

وہ بالکل سکتے کی سی حالت میں خاموش رہا ۔ اور زاہدہ نے اُس کے

جواب کا انتظار کئے بغیر چھٹی کو پڑھنا شروع کیا۔

زاہدہ! ....

میں تمہارے نام کے ساتھ کوئی القاب تجویز نہیں کر سکا۔ شاید تم اسے بدتمیزی پر محمول کرو۔ لیکن اگر میں اُن جذبات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جو میرے دل میں تمہارے لئے موجزن ہیں۔ کوئی القاب ڈھونڈ لیتا۔ تو شاید تم ناراض ہو جاتیں۔ اور تم جانتی ہو مجھے تمہاری ناراضگی کسی صورت میں قبول نہیں ——————

زاہدہ! یہ خط میں تمہیں کبھی نہ لکھتا۔ مگر نہ جانے جب بھی میں نے سوچا کہ تمہیں بھول جاؤں، تمہاری مسلسل بے اعتنائیوں سے گھبرا کر تمہارا خیال چھوڑ دوں، میرے دل پر جیسے پے بہ پے برچھیوں کے وار شروع ہو جاتے ہیں۔ اور میں بے بس ہو کر تمہارے حسین تصور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں جاگزین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں —————— تم بہت خوب صورت ہو —————— کتنی؟ شاید چاند سے پوچھوں تو جواب دے، ستاروں کی سُرمگیں مسکراہٹوں کو چراؤں تو اس کا تجزیہ کر سکوں۔ پھولوں کی رنگت اُڑاؤں تو سمجھ سکوں۔ بہاروں کا حاصل ملے تو کہوں، اٹھلاتی ہوئی نسیم کے قدم چُوموں

Taj Tahir Foundation

تو سمجھوں۔ موسیقی کی سحر آفرین نغمگی کا اثر ڈھونڈوں تو بیان کروں ——— غرض مظاہرِ فطرت کی تمام رعنائیوں کو اکٹھا کروں۔ تو شاید وہ تاثر پیدا ہو۔ جو تمہارے حُسن کی دلفریبیوں اور دل کشائیوں میں ہے۔

مَیں نے جب بھی تمہیں دیکھا ہے، میرے دِل کے بُجھے ہوئے کنول پھر سے جَل اُٹھے، میں اس دنیا میں بہت تنہا ہوں، شاید دوسرے لوگ اس کا احساس نہ کریں، یا شاید تم سے علیحدگی اور تمہاری بے رُخی ہی نے مجھے ایسا سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے دنیا کی تمام راحتیں میسّر ہیں۔ زندگی کی تمام آسائشوں سے میں پوری طرح بہرہ ور ہوں، مگر جب تم نہیں تو یہ کائنات ایک دہکتی ہوئی جوالا ہے۔ جہاں میں ایک جہنمی کی طرح جَل رہا ہوں،

کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اس جہنم کو چمن زاروں میں تبدیل کر دو۔ میری زندگی کی اداسیوں کو دور کر کے اسے مسرّتوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کر دو۔

تمہارا تجمل

جب زاہدہ پورا خط پڑھ چکی تو تجمل بڑی سرعت کے ساتھ کلاس روم سے باہر نکل گیا۔ اور زاہدہ نے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین

Taj Tahir Foundation

پر سپینک دیا۔ پھر ساری کلاس سے مخاطب ہو کر بولی۔

"ارے! تم سب بچے ہو، میں تم سب کی ماں ہوں، کیا ہوا جو لڑکی ہوں، تمہاری ایک ایک کی دُرگت بنا سکتی ہوں، ــــــ تھوڑے سے توقف کے بعد! ــــــ یہ آج کل کے چھوکرے بھی عجیب ہیں، جمعہ جمعہ آٹھ دن ان کی پیدائش کو ہوتے ہیں، اور نکل کھڑے ہوتے ہیں عشق فرمانے"

اتنے میں پیریڈ شروع ہو گیا، اور تمام لڑکے اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔ میں نے اس دن کوئی پیریڈ اٹینڈ نہیں کیا، بلکہ تجمل کے کلاس چھوڑنے کے چند منٹ بعد میں بھی کلاس سے باہر آ گئی، لیکن تجمل جا چکا تھا،

یہ تجمل کا کلاس میں آخری دن تھا، اس کے چلے جانے کے بعد کلاس مجھے یوں سونی سونی دکھائی دینے لگی کہ کالج میں میری دلچسپی بہت حد تک کم ہو گئی۔ اور میں کئی کئی دن کلاس سے غیر حاضر رہنے لگی، ایک دفعہ مسلسل چار روز تک غیر حاضر رہنے کے بعد جب میں پانچویں روز کالج میں آئی، تو کلاس میں ایک نیا طالب علم داخل ہو چکا تھا، سب لڑکے اُسے Baloo کہہ کر پکارتے تھے۔ میں حیران تھی، کہ وہ میری اتنے تھوڑے دنوں کی غیر حاضری کے دوران ہی کالج میں داخل بھی ہوا، اور پھر ہر ایک طالب علم سے اس طرح گھل مل گیا، جیسے برسوں

سے ان کے ساتھ جان پہچان رہی ہو۔

جو بات مجھے سب سے زیادہ اچنبھے کی معلوم ہوئی، وہ یہ تھی کہ زاہدہ کی شرارتوں میں بے حد کمی واقع ہو گئی تھی، کہاں وہ باتونی پن کہ ایک منٹ بھی کلاس پروفیسر سے خالی ہوئی، تو اُس نے شور وغل سے آسمان سر پر اُٹھا لیا، اور کہاں یہ سکون پسندی کہ پیریڈ ختم ہوتے ہی بغیر کسی سے بات چیت کئے چپ چاپ کلاس سے رخصت ہو جاتی، یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے بناؤ سنگھار میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ کر دیا، اور جُوڑے کی بجائے اپنے بالوں کی چوٹیاں گوندھنا شروع کر دی تھیں، لباس اس قدر ریچ کرتا ہوا پہننے لگی تھی، کہ بے مجھے بھی خوب صورت دکھائی دینے لگی، اور ایک دن جب وہ سُرخ جوڑا، سُرخ دوپٹہ، سُرخ سینڈل پہنے کلاس میں داخل ہوئی، تو ایک ساتھ تمام لڑکوں کی نظریں اُس کی طرف اٹھیں، غضب یہ تھا کہ اُس دن اپنے بالوں میں اُس نے گلاب کا جو پھُول لگا رکھا تھا، وہ بھی بالکل سُرخ رنگ کا تھا، جھکی جھکی سی نظریں: قہقہوں کی جگہ ہنسی اور ہنسی کی بجائے صرف مُسکراہٹ! آخر یہ کیا ماجرا تھا، کہ اس کی رگ رگ میں سماتی ہوئی شوخیوں نے شرم وحیا کا اتنا خوب صورت لبادہ اوڑھ لیا تھا، مجھے تو اس کی روز بروز بڑھتی ہوئی نفاست پسندی سے یوں احساس ہونے لگا

Taj Tamir Foundation

تھا، جیسے اُس نے اپنے تمام چلبلے پن کو کسی خاص شخص اور کسی خاص موقع کے لئے چھپا کر رکھ دیا تھا، اور ایک دن اُس کا اِس طرح اظہار کرے گی، کہ دیکھنے والا مارے حیرت کے دم بخود رہ جائے،

تھوڑے ہی دِنوں کے بعد ایک واقعہ بہت عجیب ہوا، زاہدہ لان میں اپنی دو ایک سہیلیوں کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی، اتنے میں "B[illegible]" وہاں آیا، اور زاہدہ کی چوٹی کو ذرا سا کھینچا، اور اس حرکت کے بعد یوں اطمینان کے ساتھ اپنے دوستوں سے ہنسی مذاق کرنے لگا، جیسے اُس نے کچھ کیا ہی نہیں، میرا خیال تھا، زاہدہ اُسے کچّا چبا جائے گی، مگر اِتنے شدید طریقے سے میرے اِس خیال کی تردید ہوتی، کہ زاہدہ کے بناؤ سنگھار، اس کی متانت اور اِس قدر رکھ رکھاؤ کا سارا بھید بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہو گیا، وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی، چنانچہ B[illegible] سے کچھ کہنے کی بجائے اُس نے صرف ذرا سا مُسکرانا کافی سمجھا،

آہستہ آہستہ وہ آپس میں بہت زیادہ مِلنے لگے، اِکٹھے سیر کو جاتے، اکٹھے ٹک شاپ میں کھاتے پیتے، غرض لڑکوں کی "ہوا" زاہدہ، دوسروں پر آسانی کے ساتھ غالب آجانے والی زاہدہ B[illegible] سے اِس قدر مغلوب ہوئی، کہ بالکل

Taj Tamir Foundation

بھیگی بلی بن گئی،

یہ ٹھیک ہے کہ ہماری کلاس اب زاہدہ کے قہقہوں سے نہ گونجتی تھی،
اُس کی شرارتوں سے لڑکوں کا ہر دم ناک میں دم نہیں آیا رہتا تھا، مگر اب اُس سے کہیں زیادہ شرارتی اور ہنس مکھ سا لڑکا ہماری کلاس میں موجود تھا، خواہ کوئی شخص زندگی میں پہلی بار اس سے ملا ہو، لیکن وہ اُسے بھی مذاق کرنے سے نہ چُوکتا، اُس کا لمبا تڑنگا بے ڈول قد، مائل بہ فربہی جسم، ہلکا گندمی رنگ، میرے خیال میں تو اُسے دیکھ کر وجاہت سے زیادہ ہیبت کا تاثر پیدا ہوتا تھا، اس کے اور تجمل کے درمیان اتنا ہی فرق تھا، جتنا زاہدہ اور تجمل کے درمیان۔

پورا ایک مہینہ ہونے کو آیا، کسی نے کالج میں تجمل کی شکل نہ دیکھی، میں سخت پریشان تھی، وہ کلاس میں آیا کرتا تھا، مجھے قدرے ڈھارس رہتی تھی، اب جو مہینہ بھر اسے دیکھنا نصیب نہ ہوا، تو دل بے قرار ہو گیا، ہر وقت اس کا چہرہ آنکھوں کے سامنے رہتا، کئی دفعہ چاہا کہ اُس کے گھر جا کر اُس کا پتہ پوچھوں مگر ہر بار نہ جانے کیا سوچ کر اس خیال کو ترک کر دیتی، صبح صبح جب کالج میں آتی تو سب سے پہلے میری نظریں تجمل کو تلاش کرتیں، پہلا پیریڈ تو میرا اسی انتظار میں گزر جاتا، شاید تجمل کو راستے میں دیر ہو گئی ہو، وہ ابھی کلاس میں داخل ہو گا،

Taj Tahir Foundation

اور میری برابر کی سیٹ پر بیٹھ جائے گا۔ میں اُسے کنکھیوں سے دیکھوں گی، وہ میری طرف نظر تک نہ اٹھائے گا، لیکن مجھے کس قدر اطمینان رہے گا، کہ وہ میرے پاس بیٹھا ہے،

مجھے زاہدہ سے سخت نفرت ہو گئی تھی، جب کبھی اُسے دیکھ لیتی، مجھے کسی مکار جادوگرنی کا احساس ہونے لگتا، جس نے اپنے منحوس آسیب سے تجمل کی ساری خوشیاں چھین لی ہوں، آخر جب میری مایوسی بے حد بڑھ گئی، تو مجھ سے نہ رہا گیا، ایک دن کالج سے چھٹی ہونے کے بعد میں تجمل کے گھر پہنچی، برآمدے میں جا کر گھنٹی بجائی، تھوڑی دیر بعد ایک خادمہ باہر آئی، اس نے ایک لمحے کے لئے میرا جائزہ لیا، پھر بولی۔

"کسے ملنا ہے بی بی جی، ثریا بیٹیا تو گھر میں نہیں ہے۔"

میں نے سوچا اس بڑھیا سے کیونکر کہوں کہ میں ثریا سے نہیں، تجمل سے ملنے آئی ہوں۔ میرا دل قدرے کانپ رہا تھا، سوچا لوٹ جاؤں، دوبارہ کسی وقت جب ثریا گھر میں ہو تو چلی آؤں، لیکن تجمل کی خیریت دریافت کرنے کے خیال نے میرے پاؤں میں جیسے بیڑیاں ڈال دی تھیں،

میں نے کہا،

"تجمل صاحب گھر میں نہیں ہیں کیا؟"

"وہ تو بے چارے گھر ہی میں ہیں"

سہم سے، جیسے میرے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی،

"خیریت تو ہے؟" میں نے بڑھیا سے پوچھا۔

"کہاں بیٹا، ایک مہینہ ہونے کو آیا، لیسے چارپائی پر پڑے ہیں تجمل بابو

کہ زمین پر قدم نہیں دھرا"

میرے تو یہ سُن کر اوسان خطا ہو گئے۔

"کہاں ہیں وہ اِس وقت؟"

"آئیے میرے ساتھ، میں آپ کو ان کے پاس لئے چلتی ہوں"

اور وہ مجھے گھر کے اندر لے گئی۔ تجمل ایک کمرے میں بڑے تکئے پر سر رکھے

آنکھیں بند کئے پڑا تھا، میں نے قریب جا کر بلایا، تو آہستہ سے آنکھیں کھول دیں،

ایک سیکنڈ کے لئے مجھے دیکھا، اور اپنے ہونٹوں پر مصنوعی ہنسی لاتے ہوئے، مجھے کرسی

پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، میں بیٹھ گئی تو اُس نے پھر آنکھیں بند کر لیں، میں دو تین منٹ

تک اسے غور سے دیکھتی رہی، اُس کا پھول سا چہرہ بالکل مُرجھا گیا تھا، آنکھوں کے

گرد ہلکے سیاہ گڑھے پڑ گئے تھے، مگر اُس کے حُسن میں کچھ کمی واقع نہیں ہوئی تھی، البتہ

Taj Tahir Foundation

اس کے چہرے پر غم و اندوہ کی لکیریں پہلے سے زیادہ گہری اور نمایاں ہو گئی تھیں،

اتنے میں تجمل کی والدہ وہاں آگئیں، تھوڑی ہی دیر کے بعد تین چار نوکر بھی تجمل کی چارپائی کے گرد اکٹھے ہو گئے، اس کی والدہ نے میرے ساتھ کوئی گفتگو نہ کی، معلوم ہوتا تھا جیسے تجمل کی فکر میں اندر ہی اندر غم سے نڈھال ہوتی جا رہی ہیں، نوکر مجھے بُری طرح گھور رہے تھے، گویا میں ہی تجمل کی بیماری کا سبب تھی میں چند منٹ اور وہاں بیٹھی، اور پھر ماحول کی اجنبیت کی تاب نہ لاتے ہوئے بغیر کسی سے اجازت لئے وہاں سے رخصت ہو گئی،

جب میں ان کے گھر سے باہر نکلی تو میرا جی پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہتا تھا، میں نے بہتیرا ضبط کیا، لیکن میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا، میں جوں جوں انہیں روکنے کی کوشش کرتی تھی، وہ اور جی بھر کر باہر نکلتے تھے تقریباً ایک گھنٹے تک میری یہی کیفیت رہی، آخر بڑی مشکل سے اپنے اوپر ضبط کیا، گھر پہنچی تو میری آنکھیں رو رو کر سُرخ ہو رہی تھیں، امّی نے پوچھا تو میں نے کچھ جواب نہیں دیا، جب انھوں نے بہت اصرار کیا تو میں پھر رونے لگی، اور کہا کہ میرا ایک کلاس فیلو سخت بیمار ہو گیا ہے،

"تو اس طرح رونے سے کیا ہوتا ہے" وہ بولیں،

Taj Tahir Foundation

"خدا سے دعا کرو، ٹھیک ہو جائے گا"

مگر میرا دل کہہ رہا تھا، کہ وہ اب کبھی ٹھیک نہ ہو گا، اُس کی منفعل نگاہوں نے مجھے واضح طور پر بتا دیا تھا، کہ وہ زندگی کا سراغ کھو چکی ہیں،

اُس سے اگلے روز میں کالج نہ جا سکی، دوسرے دن جب آخری پیریڈ ختم ہو چکا، تو میں لائبریری سے کچھ کتابیں نکلوانے جا رہی تھی؛ کاریڈار میں سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا، کہ ہسٹری کے نیم روشن کمرے میں زاہدہ اور Basheer آپس میں گلے مل رہے تھے، میں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی؛ عین اُسی وقت قریب ہی میری کلاس کا ایک لڑکا دوسرے سے کہہ رہا تھا،

"تم نے سنا شبیر، بے چارہ تحمل چل بسا"

Taj Tahir Foundation

بجھے دیپ

Taj Tahir Foundation

بڑے زمیندار کے کھیتوں کا سلسلہ جس جگہ جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں گھاس پھونس کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں کامنی اور اس کا ننھا بچہ سدیو رہتے تھے۔ دو سال ہوئے کامنی کا خاوند اس دنیا سے چل بسا تھا۔ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ لاکھ مصیبتیں سہیں۔ لیکن اپنے خاوند کی سنگت میں اسے ان مصیبتوں کو برداشت کرنے میں بھی ایک گونہ لطف ملتا تھا۔ اب سارے دکھوں کا بوجھ اس کی کمزور جان پر آن پڑا تھا۔ مگر اس نے صبر کیا اور اپنے بچے کے مستقبل کا سہارا لے کر زندگی کو پھر سے ہنسی خوشی گزارنے لگی۔

آج پورے تین روز سے ننھا سدیو بخار میں مبتلا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اسے غشی کے دورے پڑتے تھے۔ بیچاری فکر سے نیم جان ہو گئی۔ آخر جب کچھ بن

نہ پڑا تو وہ دوڑی ہوئی زمیندارنی کے پاس گئی۔ اور رو رو کر اسے اپنے بیٹے کی بپتا سنانے لگی۔ زمیندارنی نے اور تو کچھ نہ کیا۔ گاؤں سے تین چار میل کے فاصلے پر سرکاری شفاخانہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا پتہ بتا دیا۔ کامنی فوراً واپس اپنی جھونپڑی میں آئی۔ ننھے سدیو کو اچھی طرح کپڑے سے ڈھانپ کر خود دوائی لینے کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔ اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔ گرد و غبار سے ملے ہوئے کہرے کا خفیف سا بادل کھیتوں کے چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے جھونپڑے کو دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گاؤں سے بہت آگے نکل گئی۔ اس کا دل کسی نامعلوم خوف سے کانپ رہا تھا۔ شام کی افسردہ اور پُر ملال خاموشی نے ساری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہوا ساکن تھی۔ لیکن اس کے جسم اور دماغ کا ایک ایک حصّہ بے پناہ شورش اور حرکت سے معمور تھا۔ ابھی اس نے بصد مشکل دو میل طے کئے ہوں گے کہ رات کے سیاہ چھنے نے کائنات کی ہر شے کو اپنے دامن میں چھپانا شروع کر دیا۔ اپنے بچے کے غم کے علاوہ کامنی کو اب ایک اور غم لاحق ہونے لگا۔ وہ واپس گھر کیسے پہنچے گی۔ اکیلی جان، عورت ذات، مگر وہ برابر اپنے قدم آگے بڑھائے چلی جا رہی تھی۔

رات کی تاریکی فضا میں پوری طرح سرایت کر چکی تھی کہ وہ ہسپتال کے بڑے دروازے میں داخل ہوئی۔ لیکن وہاں کسی آدمی کا نام و نشان نہ تھا، اس نے گھر سے روانہ ہونے سے

Taj Tahir Foundation

پہلے ان مشکلات کے متعلق مطلقاً کچھ نہ سوچا تھا۔ اس کی ممتا نے آنے والی ہر وقت کو پس پُشت ڈال دیا تھا۔ وہ تو صرف دوائی چاہتی تھی۔ جس سے اس کے پیارے بچے کی زندگی بچ جائے۔

کچھ دیر ادھر ادھر جستجو کرنے کے بعد اسے ایک کمرے سے روشنی نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ فوراً اس طرف بھاگی، دروازے پر پہنچ کر اس نے آہستہ سے دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد چٹخنی گرنے کی آواز آئی، اور دروازہ کھلا، ایک دوہرے قسم کا پستہ قد آدمی ریشمی کپڑے کا گاؤن پہنے، ہاتھ میں سگریٹ سلگائے اس کے سامنے کھڑا تھا، یہ ڈاکٹر تھا، کامنی کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک خفیف سی مکروہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بالکل پُرسکون اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کھڑا تھا، کامنی ابھی ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے نہ پائی تھی کہ ڈاکٹر نے برق رفتاری کے ساتھ اس کی کلائی پکڑی...... اور کھینچ کر کمرے کے اندر لے گیا۔ چٹخنی چڑھنے کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ اور روشنی گُل ہو گئی۔

ہوائیں چیخیں، بادل گرجے، پرندے اور چوپائے تلملا کر اپنی نیندوں سے بیدار ہو گئے، چنار کے درخت ایک دوسرے کے ساتھ سر پٹخ کر زار و قطار روئے، ساری فضا میں ماتم کی صفیں بچھ گئیں۔

Taj Tahir Foundation

. . . . اور جب کامنی کمرے سے باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں دوائی

کی ایک چھوٹی سی شیشی تھی، وہ اسے اس قدر مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی، جیسے اس کی ساری زندگی کا سرمایہ صرف دوائی کی ایک یہ شیشی ہی تھی، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، خوف اور نقاہت کی وجہ سے اُس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں، ہسپتال سے باہر چاروں طرف گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دُور دائیں طرف ٹیلے کے ذرا اُوپر، تاروں کی طرح جگمگاتی ہوئی مکانوں کی روشنیاں کامنی کے آنسوؤں میں تیر رہی تھیں۔ اس کا دل یاس اور نامرادیوں سے بُری طرح گھبرا ہوا تھا اس کی رُوح کچھ اس قسم کی اذیت محسوس کر رہی تھی، جیسے اچانک کسی شخص کو ایک لامتناہی گہرے کھڈ میں دھکیل دیا جائے، اور کھڈ کی نکیلی اور تیز چٹانیں اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی الگ کر دیں۔

ایک دم اسے ننھے سدیو کا خیال آیا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے جھونپڑے کی طرف چلنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد مکانوں کی روشنیاں صاف اور نمایاں ہو کر نظر آنے لگیں۔ قصبے کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک عجیب اندوہناک تضاد اس کے دل میں پیدا ہوا، وہ سوچنے لگی۔ ان مکانوں میں رہنے والے کتنے آرام اور سکون کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار رہے ہوں گے، اور میں ہوں جس کا ایک ایک لمحہ مسلسل

کرب اور پریشانی میں گزرتا ہے۔

گھر پہنچ کر کامنی نے سب سے پہلے سدّبو کو اپنے گلے سے لگایا، اس کے سر، چہرے اور ہاتھوں کو جی بھر کر چوما۔ پھر دوائی کی ایک خوراک پیالے میں انڈیلی، اور سدّبو کو پلادی، بخار کی وجہ سے اس کا جسم لوہے کی طرح تپ رہا تھا لیکن آدھ گھنٹہ بعد ہی اس کا بخار اُترنے لگا اور خود بخود اس نے اپنی آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا —— جیسے اس کی بیماری دوا کا نہیں بلکہ محض کامنی کے ساتھ اس بہت بڑے حادثہ کا انتظار کر رہی تھی —— کامنی اپنے بچے کو تندرست ہوتا ہوا دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد اس کا دل پھر پشیمانی کی خوفناک دلدلوں میں پھنس گیا۔

ایک دو روز کے بعد سدّبو بالکل تندرست ہو گیا۔ اور کامنی دوبارہ کھیتوں میں کپاس چننے کے لئے جانے لگی۔ جھلملاتی ہوئی دھوپ میں اس کی سفید پیشانی پر سے پسینے کے قطرے موتی بن بن کر کھیتوں کی سخت اور کڑیل مٹی میں گرتے رہے۔ اور فطرت ہر انجام سے بے پروا اپنے نتائج برآمد کرنے میں مگن رہی۔ کامنی کی نظریں خواہ مخواہ اپنے شریک کار ساتھیوں کے سامنے جھکنے لگیں۔ اب وہ تھک بھی بہت جلد جاتی۔ اس کا سر چکراتا۔ اور وہ کام کرتے کرتے کھیتوں کی منڈیر پر بیٹھ جاتی۔ وہ اپنی ہمجولیوں میں سب سے زیادہ محنتی اور جفاکش

Taj Tahir Foundation

مشہور تھی۔ لیکن طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ہر شخص اسے سُست اور کام چور کہنے لگا۔ اَب کی بار ہفتہ کی مزدوری بھی اسے سب سے کم ملی۔ آخر وہ دن آن پہنچا۔ جب اس کی ایک ہمجولی نبلاں نے اس کے اضمحلال کا راز پالیا۔ اس دن کے بعد کامنی نے کھیتوں میں آنا بالکل چھوڑ دیا۔ وہ سارا سارا دن گھر میں پڑی رہتی۔ شام کو جب اندھیرا پھیلنے لگتا تو زمیندارنی کے گھر جاتی، اس کے برتن وغیرہ صاف کرتی اور بچا کھچا کھانا لے کر واپس جھونپڑے میں آجاتی۔ ادھر نبلاں کی بدولت سارے گاؤں میں کامنی کی بدچلنی کے چرچے ہونے لگے۔ بہت سے اِسے محض افواہ سمجھتے لیکن زیادہ یہی کہتے کہ وہ تھی ہی ایسی۔ آخر جب یہ بات زمیندار کے کانوں تک پہنچی تو وہ خود اس بات کی تصدیق کے لئے کامنی کے جھونپڑے میں آیا۔ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی —— بیچاری کامنی زمیندار کے پرجلال چہرے کی تاب نہ لاکر تھر تھر کانپنے لگی۔ زمیندار نے ایک دو منٹ کے لئے اسے نہایت تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا! اور پھر دفعتہً ایک جھٹکے کے ساتھ جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد کامنی کا زمیندار کے ہاں جانا بھی بند ہوگیا۔ فاقوں پہ فاقے گزرنے لگے۔ اور بے چارے سدیو کو باسی روٹیوں کے بجائے اب کئی کئی دن کے سوکھے ٹکڑے کھانے کے لئے ملنے لگے۔

Taj Tahir Foundation

موسم میں خنکی بے پناہ آگئی تھی۔ درخت قریب قریب ٹنڈ منڈ ہو چکے تھے۔ گاؤں کی گوریوں کے نغمے مدھم پڑ چکے تھے، ہر چیز گویا دادِ عیش دینے کے بعد اپنی اپنی آرام گاہوں میں سستانے کے لئے چلی گئی تھی۔ دو ہی ایک روز میں برف باری شروع ہو گئی۔ اور مسلسل ایک ہفتہ تک ہوتی رہی۔ سرما کی طوفانی ہواؤں کے ڈر سے پہاڑوں نے اُون کی مانند سفید لباس زیبِ تن کر لیا۔ اور تبّت کے لاماؤں کی طرح کسی پُر اسرار مابعد الطبیعیاتی مسئلہ کی گہرائیوں میں کھو گئے۔

ایک رات جب چاروں طرف بادل چھائے ہوئے تھے، ہوا کے شور نے ہر ذی رُوح کی زبان گنگ کر دی تھی۔ اور وہ سہمے ہوئے اپنے اپنے بسیروں میں جا چھپے تھے، اچانک بجلی کا زور سے کڑکا ہوا۔ اور کامنی کی کوکھ سے ایک اور جیتی جاگتی ہستی اس دنیا میں آگئی۔ مگر کامنی اور زیادہ دکھوں کی تاب نہ لاتی ہوئی زندگی کی قید سے چھٹکارا حاصل کر گئی۔

صبح جب سدیو کی آنکھ کھلی تو طوفان بالکل تھم چکا تھا۔ سورج کی شعاعیں جھونپڑی کی درزوں سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ ایک لحظہ کے لئے سدیو نے اپنی آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا اور جھونپڑے میں غیر معمولی خاموشی کی وجہ سے گھبرا کر چارپائی سے نیچے اتر آیا۔ اس کی ماں آنکھیں بند کئے نہایت اطمینان سے چارپائی پر قدرے

ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک ننھا منا بچہ انگوٹھا چوس رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں کے سرہانے کھڑے ہو کر زور زور سے اسے پکارا۔ لیکن وہ اسی طرح چپ سادھے رہی۔ سدیو سہم سا گیا۔ جب اس کے بار بار بلانے پر بھی کامنی نے آنکھیں نہ کھولیں۔ تو اس نے اپنی انگلیوں سے ماں کے پپوٹوں کو ایک دوسرے سے خود ہی علیحدہ کر دیا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ ویسی ہی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ تب تو ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ عین اس وقت زمیندار کا نوکر ربو جھونپڑے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے چیخوں کی آواز سنی۔ تو جھونپڑے کی طرف لپکا۔ دیکھا تو کامنی مری پڑی ہے! اور سدیو زار و قطار رو رہا ہے۔ اس نے جھونپڑے کا دروازہ بند کیا! اور سدیو کو اپنے ساتھ لے کر گاؤں کی طرف چل دیا۔

بادل اُمڈ اُمڈ کر آ رہے تھے! اور رات کی سیاہی تاریک سے تاریک تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا کے تند و تیز جھونکوں سے ایک ایک پیڑ لرزہ براندام تھا۔ اور جب کبھی بجلی چمکتی، برف سے ڈھکے ہوتے پہاڑ چاندی کی طرح دمک اٹھتے۔ چاروں طرف ایک ہُو کا عالم تھا۔ لیکن ہوا کا شور و غوغا ایک ڈراؤنی چیخ کی طرح اس کو چیر کر ہر سمت ویرانیاں بکھیر رہا تھا۔ عین اس وقت کامنی کے جھونپڑے سے

کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر کچھ آدمی اپنے ہاتھوں میں مشعلیں اٹھائے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ جھونپڑے کے بالکل قریب آ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گھاس پھونس کا بنا ہوا جھونپڑا آگ کے خطرناک الاؤ میں تبدیل ہو گیا۔ ننھا سدّبو جسے رینو اپنے ساتھ گاؤں لے گیا تھا۔ دوبارہ ان لوگوں کے ساتھ اسی جگہ واپس چلا آیا تھا۔ آگ کے بلند شعلوں نے اِردگرد کے ماحول کو دھکا سا دیا تھا۔ اور ان کا عکس دُور برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر پڑتا ہوا ایک خوفناک نظارہ پیش کر رہا تھا۔ سدّبو کبھی ان اٹھتے ہوئے شعلوں کو ایک نظر دیکھ لیتا۔ اور کبھی پہاڑیوں پر جمی ہوئی برف پر نگاہیں گاڑ دیتا۔ اس کا ننھا سا ذہن اس نظارے کے شدید سرد اور شدید گرم تاثر کو برداشت نہ کر سکا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

اسی گاؤں کی گلیوں میں جہاں کا منی بڑے زمیندار کے دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کے قریب ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں رہا کرتی تھی، ایک سات آٹھ سال کا بچّہ ننگ دھڑنگ اور نہایت مجنونانہ حالت میں پھرا کرتا ہے، اُسے گرما کی جھلس دینے والی لوئیں اور سرما کی تیروں کی طرح چھید دینے والی ہوائیں کچھ نہیں کہتیں۔ جنہیں معلوم نہیں کہ وہ کون سا عظیم حادثہ تھا جس نے اُسے ہر قسم احساس سے

عاری کر دیا تھا، وہ اُسے دیوتا سمجھتے ہیں حالانکہ وہ تو انسانیت کے سینے پر ایک رِستا ہوا ننگا ناسُور ہے۔ جو قدرت نے محض اس لئے کھلے بندوں رکھ چھوڑا ہے تاکہ اشرف المخلوقات اسے دیکھے اور شرم کی وجہ سے اپنی بزرگی اور عظمت کے بال نوچ ڈالے ❊

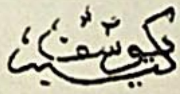

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

نیا افسانہ

سعادت حسن منٹو	بادشاہت کا خاتمہ	۰	۳
احمد ندیم قاسمی	درودیوار	۸	۲
شوکت صدیقی	تیسرا آدمی	۰	۳
ہاجرہ مسرور	اندھیرے اجالے	۰	۳
خدیجہ مستور	چند روز اور	۰	۳
انور	منزل کی طرف	۸	۳
اے - حمید	خزاں کا گیت	۸	۳
میرزا ادیب	جنگل	۸	۲

مکتبہ اردو - لاہور

Taj Tahir Foundation

ناول ، ناولٹ

• اے - حمید

ڈربے	۰	۴
جھیل اور کنول	۰	۴
جنگل روتے ہیں	۰	۴
جہاں برف گرتی ہے	۴	۲

☆

• عصمت چغتائی

ٹیڑھی لکیر	۸	۵
ایک بات	۰	۳

☆

• ابو سعید قریشی

تہمت	۰	۳
ڈرپوک	۸	۲

☆

• انتظار حسین

نئی پود	۸	۳

☆

• ظہور الحسن ڈار

باسی	۰	۲

☆

• حمید اختر

بے برگ و گیاہ	۴	۱

مکتبہ اردو - لاہور

سرورق : رپن پریس ، لاہور میں چھپا

Taj Tahir Foundation